اشتیاق فاطمہ عظمی
پہلی قسط

سسی پنوں

دریا کے اس پار اُجلا گھاٹ کی مٹیالی پہاڑوں کی اوٹ سے دھندلا سا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ صبح کاذب کی سنہری مدھم سی کرنیں ماحول کی تاریکی کو چھانٹنے کیلئے سینت سینت قدم دھرتی، دھرتی پر ہر سو بکھرتی جارہی تھیں، سبک روی سے محوِخرام دریا سے گزرتے ہوا کے مدھر جھونکوں میں رچی، بے نام سی خنکی اور شگفتگی، گھونسلوں اور چھتنار پیڑوں کی شاخوں پر بیٹھے اپنے نرم پروں میں چونچیں دیئے نیند میں ڈوبے پرندوں کو گدگدا گدگدا کر جارہی تھی اور فضا کا خوابناک سکوت ان کی نقرئی چہکاروں سے رفتہ رفتہ ٹوٹتا جارہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں بستی کی مسجد سے موذن کی پُرسوز اور پُرتاثیر آواز اللہ کی وحدانیت کا اعلان بن کر ابھری اور ہر سمت اس کے لحن کا نور پھیل گیا۔ اذان کی آواز سن کر بھنبھور کے دھوبیوں کی بستی کے کھیا محمد کی یکبارگی آنکھ کھل گئی تھی۔

وہ ایک ادھیڑ عمر کا صحت مند شیریں گفتار، ملنسار اور لوگوں سے محبت کرنے والا انسان تھا۔ اس کے اخلاق کی وجہ سے بستی کے سب ہی لوگ اس سے محبت واحترام سے پیش آتے تھے۔ وہ ایک کشادہ اور پختہ گھر میں اپنی نیک خصلت اور خدمت گزار بیوی سکینہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اوپر والے نے اسے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ اگر کمی تھی تو بس ایک اولاد کی، شادی کے 14 برس گزرنے کے بعد آج بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔

محمد کلمہ پڑھتا اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے چارپائی کے نیچے ٹٹول کر اپنی کھڑاویں باہر کھینچیں اور ان میں پاؤں ڈالتا، بیت الخلاء کی طرف چل دیا اور کچھ ہی دیر میں وہ سر پر پگڑ کستا مسجد کی سمت رواں دواں تھا۔

نماز فجر کی ادائیگی کے بعد جب وہ واپس گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا سکینہ جائے نماز پر بیٹھی آنچل پھیلائے بارگاہ رب العزت میں گڑگڑا رہی تھی۔ ’’اے میرے رب الوہاب، اے، بہت دینے والے، میری خالی گود بھر دے، میرا سونا آنگن بچے کی کلکاری سے آباد کردے۔‘‘ اس کی دراز پلکوں سے موتی ٹوٹ کر ایک تواتر اور تسلسل سے اس کے آنچل میں جذب ہوتے جارہے تھے۔

محمد کئی لمحوں تک مترحم اور افسردہ نظروں سے اس کی سمت تکتا رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ دعا کبھی شرف قبولیت نہیں پاسکتی کیونکہ بھنبھور کے سب ہی وید حکیم اور دائیوں نے متفقہ طور پر فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ بانجھ ہے اور کبھی ماں نہیں بن سکتی مگر وہ اپنے دیون ہار رب سے اب بھی مایوس نہیں ہوئی تھی، وہ مسلسل مانگے جاتی تھی۔

تب ہی بیرونی دروازے پر دستک ہوئی تھی اور محمد نے چونک کر داخلی دروازے کی سمت دیکھا اور نسبتاً اونچی آواز میں گویا ہوا۔ ’’کون ہے؟ دروازہ کھلا ہے اندر چلے آؤ۔‘‘

اور اگلے ہی لمحے دو افراد ایک چھوٹا سا لکڑی کا صندوق اٹھائے آنگن میں داخل ہوئے۔ ان کے چہروں سے حیرت اور سراسیمگی کے ساتھ تجسس اور جوش بھی ہویدا تھا۔ ’’کھیا جی!...... یہ...... یہ صندوق......‘‘

’’یہ صندوق کیسا ہے؟‘‘ محمد نے حیرت سے سوال کیا۔ ’’اور تمہیں یہ کہاں سے ملا؟‘‘

’’ہم صبح تڑکے گھاٹ پر جاکر ابھی کپڑے دھونے کا کام شروع بھی نہ کر پائے تھے کہ ہمیں دریا کی لہروں پر تیرتا ہوا یہ صندوق نظر آیا۔‘‘

’’اوہ!‘‘ محمد نے مشکوک اور متجسس نظروں سے صندوق کی طرف دیکھا۔ ’’تم نے دیکھا اس میں کیا ہے؟‘‘

’’ابھی نہیں۔‘‘ آگے کھڑے دھوبی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ’’مٹھل نے کہا کہ اسے آپ کے پاس لے جاکر ہی کھولنا چاہئے...... البتہ اس میں ایسی آوازیں آتی محسوس ہوئی تھیں جیسے کوئی بچہ غوں غاں کر رہا ہو۔‘‘

’’بچہ......؟‘‘ محمد مزید حیران ہوا۔ ’’بھلا اس صندوق میں کوئی بچہ کس طرح ہوسکتا ہے؟‘‘

بچے کے ذکر پر سکینہ کے کان بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ جلدی سے مصلیٰ تہہ کرکے ان سب کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔ محمد نے آگے بڑھ کر بسم اللہ پڑھتے ہوئے صندوق کا ڈھکن اٹھایا اور اس کے ساتھ ہی دیگر لوگوں کی بھی شوق اور تجسس بھری نظریں اندر جا داخل ہوئی تھیں اور یکبارگی حیرت و بے یقینی سے ساکت رہ گئی تھیں۔ صندوق کے اندر نرم گدے پر ایک بے حد پیاری اور گل گوتھنا سی بچی لیٹی انگوٹھا چوس رہی تھی۔

’’یہ تو واقعی ایک جیتی جاگتی بچی ہے۔‘‘ لحظہ بھر محمد نے ماحول کا سکوت توڑتے ہوئے جھک کر بچی کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ’’خدا جانے وہ کون ماں باپ ہوں گے...... اور جانے ان کی کیا مجبوری ہوگی...... جو انہوں نے اپنے جگر کا ٹکڑا نکال کر سرِآب رکھ دیا۔‘‘

سکینہ آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے اس بچی کو تک رہی تھی۔ بچی کے کسمسا کر روتے ہی وہ لپک کر آگے بڑھی اور محمد کے ہاتھوں سے لے کر اسے اپنی ممتا بھری آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس کے سینے سے لگتے ہی بچی خاموش اور پُرسکون ہوگئی تھی۔

کھیا جی!‘‘ ایک دھوبی نے آگے بڑھ کر محمد کا شانہ ہلاتے ہوئے پریشان لہجے میں کہا۔ ’’اس بچی کا کیا بنے گا؟ ہم اس کے ماں باپ کو کہاں ڈھونڈیں گے...... اور ڈھونڈنا بھی بیکار ہے...... اگر انہیں بچی کی ضرورت اور محبت ہوتی تو اسے یوں دریا میں کیوں بہادیتے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس بچی کو پالے گا کون؟‘‘

’’میں پالوں گی۔‘‘ سکینہ نے آگے بڑھ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’یہ کوئی لاوارث اور بدنصیب بچی نہیں ہے۔ یہ میری برسوں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ میں نے برسوں دامنِ دل پھیلا کر اسے اپنے رب سے مانگا ہے، تب یہ آج میرے دامن میں آئی ہے...... اسے میں ہرگز کہیں اور جانے نہ دوں گی...... اسے میں ماں بن کر پالوں گی...... اس پر اپنی پیاسی اور ترسی ہوئی ممتا نچھاور کروں گی۔‘‘

’’آپ کیا کہتے ہیں کھیا جی؟‘‘

’’بھلا میں کیا کہوں؟ محمد کی گھنی مونچھوں تلے چھپے باریک لبوں سے مسرور مسکراہٹ کی کرنیں پھوٹ کر اس کے سرخ چہرے کو منور کر رہی تھی۔ ’’جو اوپر والے کی منشاء، جو اس کی ماں کا فیصلہ وہی میرا بھی فیصلہ...... یہ ہمارے اللہ کی دین ہے اس نے ہمیں یہ بیٹی عطا کی ہے...... اس کی ہم ماں اور باپ بن کر پرورش کریں گے۔‘‘

’’یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوئی۔‘‘ دونوں دھوبی مسرور لہجے میں بولے۔ ’’اس بے ماں باپ کی بچی کو ماں باپ مل جائیں گے...... اور آپ کو یہ بیٹی۔‘‘

’’کھیا جی آپ کو بیٹی مبارک ہو۔‘‘

محمد اور سکینہ کے چہروں سے یوں خوشی پھوٹ رہی تھی جیسے سچ مچ ان کے گھر بیٹی کی ولادت ہوئی ہو۔

’’آپ بچی کا نام کیا رکھیں گے؟‘‘ ایک دھوبی نے پُرشوق لہجے میں سوال کیا۔

’’میں اس کا نام ’سسّی‘ رکھوں گی۔‘‘ سکینہ نے بچی کے دلکش و رعنا چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ’’سسّی کا مطلب ہے چاند...... اور دیکھو یہ کس قدر حسین ہے...... بالکل پورے چاند کی طرح۔‘‘

محمد کو بھی یہ نام پسند آیا تھا...... اور اسی پل سے اس انجانی اجنبی بچی کا نام ’’سسّی‘‘ پڑ گیا...... اور کسی نے بھی یہ جاننے کی ضرورت نہ سمجھی کہ سسّی اصل میں کن ماں باپ کی بچی ہے؟

یہ بچی دراصل ایک برہمن پنڈت بھگوان داس کی بیٹی تھی۔ بھگوان داس شہر کے سب سے بڑے مندر کا سب سے بڑا پجاری اور پنڈت تھا۔ وہ ہندومت کا بڑا ماہر گرو سمجھا جاتا تھا۔ دور دور سے بڑے بڑے پنڈت اس سے گیتا کے پاٹھ اور اشلوک سمجھنے آتے تھے۔ اس کے گیان دھیان اور بے پناہ دولت نے اسے مغرور بنادیا تھا۔ بھنبھور کے علاوہ قرب وجوار کے بہت سے مندروں کا گرو پنڈت تھا۔ ان مندروں میں جو چڑھاوے چڑھتے ان میں آدھا حصہ بھگوان داس کا ہوتا تھا۔ خودسر، خود پسند اور متکبر ہونے کے باوجود لوگ اس کی علمیت، لیاقت اور گیان دھیان کی وجہ سے اس کی قدر کرتے تھے۔ اس سے احترام اور محبت سے پیش آتے تھے اور اسے خوش کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔

وہ مندر کے کاموں اور اپنے گیان دھیان میں اس قدر مصروف رہا کہ اپنی عمر کے 26 سالوں تک اسے شادی کا خیال ہی نہ آیا...... مگر ایک شام اس نے ایک ایسی دلکش و رعنا دوشیزہ دیکھی کہ بے اختیار اپنا دل ہار بیٹھا اور اس نے فوری طور پر شادی کا فیصلہ کرلیا۔

اس کے اس فیصلے نے سب ہی کو حیرت بھری مسرت سے دوچار کردیا تھا۔ اس کے ساتھی پنڈت پجاریوں سے لے کر عام شہری، سب ہی بے حد خوش تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ ان کے قابل احترام اور پیارے پنڈت کی شریک حیات کون بھاگوان لڑکی بننے والی ہے۔

اس لڑکی کا نام رتنا دیوی تھا۔ وہ بھی ایک پنڈت کی بیٹی تھی۔ اپنی تپسیا اور پوجا پاٹھ کی وجہ سے وہ لوگوں میں ’’دیوی‘‘ کے نام سے مشہور ہوگئی تھی۔ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ بھگوان داس دیوی سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے ساتھیوں اور ماننے والوں کو بے حد خوشی ہوئی، کیونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ بھگوان داس جیسے لائق قابل اور گیانی دھیانی پنڈت کے لئے، کوئی دیوی جیسی ہی دھرم پتنی ہونی چاہئے تھی۔

سگائی ہوگئی، لگن کی تاریخ طے ہوگئی۔ اس کا ساتھی اور نائب پنڈت کرشنا داس ہر موقع پر اس کے ساتھ رہا تھا اور تمام کام کاج میں بھی پیش پیش رہا تھا۔ سگائی والی رات وہ بھگوان داس کے گھر میں رک گیا تھا۔ بھگوان داس کو خوش دیکھ کر وہ بھی بہت خوش تھا۔

’’گرو جی! آپ کو دیوی جی کی کس بات نے متاثر کیا؟‘‘ رات کے کھانے کے بعد دونوں چہل قدمی کو نکلے تو کرشنا کے لبوں پر آخر وہ سوال آہی گیا جو کئی روز سے اس کے ذہن میں سر ابھار رہا تھا۔

’’پہلے تو اس کی سندرتا نے۔‘‘ بھگوان داس نے نیلے آکاش پر دمکتے چاند کی اور تکتے کھوئے کھوئے لہجے میں سچائی کا اعتراف کیا۔ ’’پھر اس کے اچھے وچار اور اچھے چلن نے...... وہ ایک شیتل اور گیانی ناری ہے۔‘‘

’’سچ کہہ رہے ہیں آپ۔‘‘ کرشنا داس نے تائید بھرے لہجے میں کہا۔ ’’ہم سب کے بھی یہی وچار ہیں کہ ان میں آپ کی پتنی بننے کی بھرپور لیاقت وصلاحیت ہے۔‘‘

رات بیت گئی، اگلے دن سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ بھنبھور کے ہندو معززین اور مندر کے ساتھی اس کی شادی بہت دھوم دھام سے کرنے کے خواہاں تھے، گو کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہ تھی مگر اس کے بھگتوں اور ساتھیوں کی خواہش تھی کہ شادی کے اخراجات وہ اٹھائیں گے۔

شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ شادی میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا کہ بالکل اچانک بھگوان داس کی آنکھوں میں تکلیف شروع ہوئی۔ ویدوں کا خیال تھا کہ کالے موتیا کا حملہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ علاج معالجے کی کوئی تدبیر کی جاتی، اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور وہ ہمیشہ کے لئے نابینا ہوگیا۔

اس کے چاہنے والوں نے علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ چھوڑی...... مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کی تاریک دنیا روشن نہ ہوسکی۔ رفتہ رفتہ سب ہی لوگ اس کی آنکھوں کی صحت یابی کی طرف سے مایوس ہوگئے اور معالجوں نے بھی جواب دے دیا تو بھگوان داس اپنی آنکھوں کے بجھے دیوں کے ساتھ اپنی تاریک دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لئے بالکل اکیلا رہ گیا۔

شادی کی تاریخ آگئی...... مگر سب کو اندازہ تھا کہ اب دیوی جیسی سندر اور شیتل لڑکی بھلا ایک نابینا شخص سے کیوں شادی کرے گی...... مگر اس وقت لوگ حیران رہ گئے جب دیوی خود چل کر بھگوان داس کے پاس آگئی اور بھری محفل میں اس نے اعلان کیا۔ ’’میں نے پنڈت جی سے شادی کا وعدہ کیا تھا، ہماری سگائی ہوچکی ہے، اگر حالات ٹھیک ہوئے ہوتے تو آج رات ہمارا بیاہ ہوتا مگر تقدیر نے پنڈت کی آنکھیں لے لیں اور سب کچھ بدل گیا...... مگر میرا دل اب بھی نہیں بدلا۔ اسی لئے میں چاہتی ہوں کہ بیاہ کا دن بھی نہ بدلا جائے۔ آج ہمارا لگن طے تھا۔ میری اِچھا ہے...... آج ہی ہمارا بیاہ کردیا جائے۔‘‘

’’لیکن یہ کس طرح ممکن ہے......؟‘‘ بھگوان داس نے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔ ’’میں اپنے اندھیروں سے دیوی کا سنسار تاریک نہیں کرسکتا۔‘‘

’’اگر آپ انکار کریں گے تو میں ساری عمر بیاہ نہ کروں گی۔‘‘ دیوی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’اور ایک ودھوا کی طرح جیون بتادوں گی۔‘‘

’’سورداس جی اب مان بھی جایئے۔‘‘ اس کا ساتھی اور نائب پنڈت کرشنا داس آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ تھام کر بنتی بھرے لہجے میں بولا۔ جب سے وہ بینائی سے محروم ہوا تھا، لوگوں نے اسے سورداس کہنا شروع کردیا تھا۔ لوگوں کے اصرار اور دیوی کی ضد کی وجہ سے آخرکار سورداس کو بیاہ کے لئے راضی ہونا پڑا۔

اور اسی رات وہ دیوی کو بیاہ کر اپنی تاریک دنیا میں لے آیا۔ دیوی کے آتے ہی جیسے اس کی ویران دنیا میں پھر سے بہار آگئی۔ ہر سمت خوشیوں کے ہزاروں دیپ جل اٹھے تھے۔ دیوی ایک بے حد اچھی اور محبت کرنے والی پتنی ثابت ہوئی تھی۔ وہ اسے اس کے اندھے پن کا بالکل احساس نہ ہونے دیتی تھی۔ وہ سائے کی طرح ہر پل اس کے ساتھ رہتی اور جی جان سے اس کی خدمت کرتی۔ دونوں باہم بے حد خوش تھے، دیکھتے ہی دیکھتے، دو سال بیت گئے۔ دیوی امید سے تھی اور چند دنوں بعد ماں بننے والی تھی۔ ماں باپ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی ان کی پہلی سنتان کا بے چینی سے انتظار تھا۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور دیوی نے ایک چاند سی بیٹی کو جنم دیا۔ سورداس بیٹے کی توقع باندھے ہوئے تھا، اس لئے بیٹی کی خبر نے اسے خاصا مایوس کیا تھا مگر دیگر لوگ خوش تھے اور دیوی تو بے حد خوش تھی۔ وہ اپنی سندر بیٹی کا چہرہ تکتے نہ تھکتی تھی۔

دستور کے مطابق جب بچی چھ دن کی ہوگئی تو بھنبھور اور قرب وجوار کے تمام جوتشی اور پنڈت بچی کی جنم پتری بنانے میں مصروف تھے۔ وہ ستاروں کی چالوں اور موسموں کی رفتار کو مدنظر رکھ کر ہر دن ہر ماہ اور ہر سال کے حساب کو پتری کے خانوں میں لکھتے جارہے تھے۔ مندر کے اندر یہ کام ہو رہا تھا اور مندر سے باہر پوری بستی کے ہندو جمع تھے۔ سورداس اور اس کی پتنی دیوی سے تعلق اور محبت کے باعث انہیں ان کی نومولود بچی سے بھی تعلق خاطر اور محبت تھی۔ وہ بھی بچی کے مستقبل سے واقف ہونا چاہتے تھے، اسی لئے سب مندر کے بڑے صحن میں جمع ہوگئے تھے۔ ہر ایک جنم پتری کا حال جاننے کے لئے بے چین و بے تاب تھا اور سب کی نظریں جنم پتری بتانے والے جوتشیوں پر جمی ہوئی تھی۔

تب ہی ایک جوتشی کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔ ’’ہے بھگوان...... یہ کیا ہے؟‘‘

’’کیا ہوا؟‘‘ کوئی خاص بات سامنے آئی کیا؟‘‘ کرشنا داس نے چونک کر سوال کیا۔

’’ہاں...... پر یہ خاص نہیں بلکہ، بہت ہی بری بات ہے۔‘‘ جوتشی نے پریشان لہجے میں کہا۔

’’بری بات؟‘‘ سورداس نے چونک کر سوال کیا۔ دیوی بھی جوتشیوں کی آواز پر کان دھرے بیٹھی تھی...... یکبارگی اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ’’ہے بھگوان دیا کرنا۔‘‘

’’جوتشی جی! کچھ بتائیں گے کہ آخر کنڈلی میں ایسی کیا بری بات دکھائی پڑی ہے؟‘‘ سورداس نے بھاری آواز اور سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

’’مہاراج...... شما کیجئے۔‘‘ جوتشی نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ’’ہمیں ذرا سمے دیجئے...... ذرا دھیرج رکھئے ابھی سب سامنے آجاتا ہے...... جب تک ہم پورا حساب کتاب نہ کرلیں، بار بار پوچھنے کی تکلیف نہ کیجئے۔‘‘

اس طرح وہ سورداس کو خاموش کرواکر دوسرے جوتشیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ پھر اس نے اپنا حساب دوسرے جوتشیوں کو دکھایا۔ ان لوگوں نے اپنے تیار کئے ہوئے خاکے سامنے رکھے اور کافی بحث مباحثے کے بعد سب نے متفقہ طور پر یہ بات تسلیم کرلی کہ بڑے جوتشی کی تیار کی گئی جنم پتری سو فیصد درست ہے۔

جنم پتری مکمل کرلینے کے بعد جوتشی سورداس اور دیوی کو مخاطب کرکے گویا ہوا۔ ’’اس جنم پتری کے انوسار یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس برہمن جات کی ہندو پتری کا بیاہ کسی مسلّے (مسلمان) سے ہوگا۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ’’بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ اتنے بڑے گیانی پنڈت کی پتری اور بیاہ کسی مُسلّے سے...... اس سے تو ہمارا دھرم بھرشٹ ہوجائے گا۔‘‘

سارے پنڈت اور جوتشی آنکھوں میں کراہیت اور نفرت لئے نومولود بچی کی سمت دیکھ رہے تھے جو حالات کی ہماہمی سے بے خبر ماں کے سینے سے لگی میٹھی نیند میں کھوئی ہوئی تھی۔

یہ تمام باتیں سن کر سورداس کی بے نور آنکھوں میں بھی غصہ اتر آیا تھا جبکہ دیوی کے ممتا بھرے دل کی دھڑکنیں عجب بے کلی و بے چینی کا شکار ہوگئی تھیں۔

’’ایسی کرم جلی ابھاگن چھوکری کو برے سمے آنے سے پہلے ہی نرکھ میں بھیج دینا چاہئے۔‘‘

’’ہاں، ہاں یہی اُپائے ہے اس دُرگھٹنا کی، کہ اس کا گلا گھونٹ کر فوراً موت کے گھاٹ اتار دینا چاہئے۔‘‘

غرض جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا، مگر سورداس اور دیوی بالکل خاموش تھے۔ سورداس کے سپاٹ چہرے سے اس کے دل کی کیفیت کا پتہ نہ چلتا تھا۔ البتہ دیوی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور پلکیں آپ ہی آپ نم ہوئی جاتی تھیں۔

ہر سمت ایک شور وغوغا کا عالم تھا۔ ایسے میں سورداس کی گرجدار آواز بلند ہوئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ ’’بڑے جوتشی نے مجھ سے جو کہا وہ سب جوتشیوں اور پنڈتوں کے برسہا برس کے علم کا نتیجہ اور ان سب کا متفقہ فیصلہ ہے۔ اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے کہ ہمارے جوتشی آسمانی دیوتاؤں کے اوتار ہیں، یہ وہی کہتے ہیں جو بھگوان انہیں بتاتے ہیں۔ ان کی زبان بھگوان کی زبان ہے اور جوتشیوں نے اپنی پوتر زبان سے یہ بری خبر دی ہے کہ برہمن جاتی کی یہ پتری جس نے ایک پجارن دیوی کی کوکھ سے جنم لیا ہے، اس کا بیاہ کسی مُسلّے سے ہوگا۔ یہ خبر میرے لئے ہی نہیں بلکہ ساری ہندو جاتی کے لئے کسی دھچکے سے کم نہیں۔ یہ بات ہمارے دھرم کے ماتھے پر کلنک ہے۔ ہمارے لئے شرم اور ڈوب مرنے کی بات ہے۔‘‘

سورداس دَم بھر کو دَم لینے کو رکا...... اور پھر اسی کرخت اور گرجدار آواز میں بولا۔ ’’میرا بھی وہی حال ہے جو تم سب کا ہے۔ میرے دل میں بھی اس بچی کے لئے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ مجھے یقین ہے...... یہی حالت میری پتنی دیوی کی بھی ہوگی۔‘‘

لوگوں کی نظریں دیوی کی سمت مڑ گئیں۔ اس نے گود میں سمٹی بچی کو کچھ اور مضبوطی سے سینے لگاتے ہوئے، اشکبار آنکھوں سے اثبات میں سر ہلا دیا، اس کے سوا وہ بھلا اور کر ہی کیا سکتی تھی۔

’’اب سوال یہ ہے کہ اس بچی کے ساتھ کیا رویہ روا رکھا جائے۔‘‘ سورداس نے سوالیہ نظروں سے پہلے عام لوگوں کی سمت پھر جوتشیوں اور پنڈتوں کی طرف دیکھا۔ ان سب کی سفاک آنکھوں سے جھانکتی بھاؤنا کو محسوس کرکے اس نے اسی طمطراق سے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ’’میری بھی یہی اچھا ہے کہ اس ابھاگن کو موت کے گھاٹ اُتار دینا ہی شبھ رہے گا...... مگر مصیبت یہ ہے کہ ہمارے رجواڑے کا راجہ آدم جان، مسلمان ہے، اگر ہم نے چھوکری کا گلا دبا کر یا کسی اور طریقے سے مارا اور بات کھل گئی تو مشکل ہوجائے گی، اس لئے کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔‘‘

پھر سب لوگ سوچ بچار میں لگ گئے اور کافی غور وخوض کے بعد ایک گیانی پنڈت نے پُرسوچ آواز میں مشورہ دیا۔ ’’ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ بچی کو ایک لکڑی کے صندوق میں رکھ کر دریا میں بہادیا جائے۔ اب یہ اس کے بھاگ وہ جئے یا ڈوب مرے، پر اس طرح یہ ابھاگن کلنک کا ٹیکا اس گھر سے تو نکل جائے گی۔‘‘

تھوڑے سوچ بچار کے بعد یہ مشورہ مان لیا گیا۔ ممتا کی ماری دیوی کے ڈوبتے دل کو بھی ڈھارس ہوئی اور بچی کے زندہ بچ رہنے کی موہوم سی امید جاگ اٹھی تھی۔ فوری طور پر اس مشورے پر عمل کی تیاری شروع ہوگئی، ہلکی لکڑی کا ایک صندوق بنایا گیا۔ یہ احتیاط کی گئی کہ ہوا تو اندر جائے مگر پانی اندر نہ جاسکے۔ دیوی نے اس کے اندر ایک نرم بچھونا بچھا کر اپنے جگر کا ٹکڑا اس پر رکھ دیا۔

اس سرمئی شام میں عجب مایوسی اور اداسی کے رنگ گھلے ہوئے تھے۔ ہواؤں میں غیر محسوس سی سسکیاں چھپی ہوئی تھیں۔ ہر سمت ایک ویرانی اور بے بسی تھی۔ آکاش کے نیلے دامن پر دیوی کے دل کا خون، ڈوبتے سورج کی لالی بن کر بکھر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی شفق رنگ ہو رہی تھیں، مگر لب خاموش تھے۔ یہ ذمہ داری ان دونوں کو سونپی گئی تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس صندوق کو دریا کے سپرد کردیں۔

’’دیوی بس اب سمے نہ لگاؤ اور صندوق کو لہروں کے حوالے کردو۔‘‘ سورداس نے سپاٹ لہجے اور قدرے کرخت آواز میں پتنی کو حکم دیا اور دیوی نے اپنے مچلتے سسکتے دل پر پتھر رکھ کر صندوق کو دریا کی لہروں کے حوالے کردیا اور وہ سب واپسی کیلئے پلٹ گئے۔

سورداس بہت مطمئن اور شانت تھا۔ اس نے اپنے خیال میں اپنے دھرم کا پالن کیا تھا اور ایک ہندو لڑکی کو مسلمان گھر میں بیاہے جانے سے بچالیا تھا اور اس طرح اس کا دھرم بھرشٹ ہونے سے بچ گیا تھا۔ وہ بینائی سے محروم تھا، اس لئے اس نے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی البتہ اس کی پتنی دیوی بار بار پلٹ پلٹ کر لہروں پر ڈگمگاتے آگے بڑھتے صندوق کو دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے مگر لبوں پر سسکیاں نہ تھیں۔ وہ اپنے کسی بھی عمل سے یہ ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے پتی کے فیصلے سے ناخوش ہے۔ اس کے لئے پتی کی خوشی ہی سب کچھ تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی بچی کی لمبی عمر اور خوشی کیلئے مسلسل دعائیں مانگے جارہی تھی۔

صندوق اپنی آغوش میں معصوم بچی کو سمیٹے تمام رات لہروں کے دوش پر سفر کرتا دریا کے دوسرے کنارے آپہنچا تھا۔ یہاں دھوبیوں کی ایک بستی تھی اور دریا کے کنارے ’’اُجلا گھاٹ‘‘ نامی ان کا گھاٹ تھا۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی کچھ دھوبی گھاٹ پر پہنچ گئے تھے، تب ہی ایک دھوبی کی نظر اس صندوق پڑی تھی جو ساحل سے آلگا تھا۔

’’ارے ذرا دیکھو تو وہ کیا چیز ہے؟‘‘ اس نے دوسرے دھوبی کو اس جانب متوجہ کرتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا۔

’’یہ تو کوئی صندوق معلوم دیتا ہے...... مگر یہ اس طرح دریا میں کیوں بہہ رہا ہے۔‘‘ دوسرے دھوبی نے غور سے صندوق کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ’’آؤ اسے نکال کر دیکھتے ہیں۔‘‘

وہ دونوں دھوبی صندوق کی طرف بڑھ گئے مگر اندر سے آتی غوں غاں، کی آوازوں نے انہیں خائف اور متوحش کردیا تھا۔

’’بخشے! اس طرح کھولنا مناسب نہیں ہوگا، چل اسے کھیاجی کے پاس لئے چلتے ہیں، وہی کھول کے دیکھیں گے اور وہی اس کا جو کرنا ہوگا، کریں گے۔‘‘

ایک دھوبی کے مشورے پر دوسرے دھوبی نے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ ’’تو ٹھیک کہہ رہا ہے...... چل صندوق پکڑ...... ہم اسے ابھی ان کے گھر لے کے چلتے ہیں۔‘‘

اور یوں دونوں وہ صندوق لئے کھیا محمد کے گھر پہنچے تھے اور محمد کی بیوی سکینہ نے اس ننھی سی بچی کو صندوق سے نکال کر اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔

’’اسے میں پالوں گی...... سکینہ نے آگے بڑھ کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’یہ کوئی لاوارث اور حالات کی ماری بچی نہیں بلکہ یہ میری برسوں کی دعاؤں کا ثمر ہے...... میں نے برسوں دامن پھیلا کر جسے اپنے رب سے مانگا ہے، یہ وہی گوہر نایاب ہے۔‘‘

اور یوں وہ بدنصیب بچی جسے حالات کے تقاضے کے تحت اس کے ماتا پتا نے خود سے جدا کردیا تھا، اس کو تقدیر نے نئے بے حد چاہنے والے ماں باپ عطا کردیئے تھے۔ انہوں نے اسے سسّی کا نام دیا تھا اور بے حد پیار اور لاڈ کے ساتھ اس کی پرورش شروع کردی تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا...... دیکھتے ہی دیکھتے سولہ برس بیت گئے۔ کل کی بے زبان معصوم اور ننھی سی بچی اب 16 برس کی ایک حسین وجمیل شوخ وچنچل حسینہ بن چکی تھی۔ اس کے حسن ودلکشی اور شادابی کے قصے چہار سو مشہور ہوگئے۔ دھوبیوں کا کھیا محمد بڑے بڑے سرداروں کے کپڑے دھوتا تھا۔ اس کی معقول آمدنی تھی۔ وہ سخی اور دریا دل تھا، مہمان نواز ایسا کہ جب تک دسترخوان پر کوئی مہمان موجود نہ ہو، نوالا نہ توڑتا تھا۔

بھنبھور کا شہر تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ روز کوئی نہ کوئی قافلہ وہاں سے گزرتا اور محمد قافلے کے سالاروں کو اپنا مہمان ضرور بناتا۔ مہمان اپنے میزبان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے اور اس کی مہ لقا بیٹی سسّی کو دیکھ کر حیران وششدر رہ جاتے...... اور اپنے شہروں میں پہنچ کر اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ اس طرح سسّی کے حسن کی داستان دور دور تک پھیل گئی۔

☆......☆......☆

کیچ مکران کی بھوری خاکستر پہاڑیاں ڈوبتے سورج کی مدھم نارنج کرنوں میں جھلملاتی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں شفق کی سرخی گھلی ہوئی تھی۔ ہواؤں کے نرم جھونکوں میں شام کا سلونا پن رچا ہوا تھا۔ کیچ مکران کے حکمراں کے اونچے پُرشکوہ محل کے اطراف پھیلے مرغزاروں میں سرسبز گھاس کے مخملی فرش پر شام اپنا سرمئی آنچل پھیلائے کسی نئی نویلی دلہن کی طرح سج سج قدم دھرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ فضا میں انواع واقسام کے پھولوں کی مشکبار مہک رچی ہوئی تھی اور رنگ برنگ پرندے چہچہاتے غل مچاتے اپنے ٹھکانوں کی جانب محوِ پرواز تھے۔ ایسے میں مکران کے حکمراں کا سب سے چھوٹا شہزادہ پنوں اپنے دوستوں کے ساتھ باغیچے میں بیٹھا غروب آفتاب کے دلکش منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ منظر تھا۔

’’جب سورج غروب ہوتا ہے تو سرخ نارنجی اور ارغوانی رنگ باہم مدغم ہوکر ایک نیا رنگ بناتے ہیں۔ ایسا حسن ایسی رعنائی شاید دنیا کی کسی چیز میں نہیں۔‘‘ پنوں نے نیلگوں آکاش پر بکھرے شفق کے رنگوں کو تکتے ہوئے، تحسین بھرے لہجے میں کہا۔

’’اگر تم سسّی کا چہرہ دیکھ چکے ہوتے تو، یہ بات ہرگز نہ کہتے۔‘‘ اس کے ایک دوست اسامہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ مشک وعنبر کے تاجر کا بیٹا تھا اور ابھی پچھلے ہی ہفتے اپنے باپ کے ساتھ تجارتی سفر سے واپس آیا تھا۔ جب ان کا قافلہ بھنبھور میں رکا تو اسے بھی اپنے باپ کے ساتھ کھیا محمد کے گھر مہمان بننے کا موقع ملا تھا اور وہاں اس نے صحرا کے چاند سسّی کو دیکھا تھا۔

’’سسّی......؟‘‘ پنوں نے چونک کر سوال کیا۔ ’’یہ کون ہے؟‘‘

’’یہ بھنبھور کے مرغزار کا گلاب ہے۔ آسمان کا چاند ہے۔ دریا کی روانی اور ہواؤں کی مستی کا نام ہے۔ فضا میں بکھری رعنائی، صبح نو کا پُرنور اجالا، ڈوبتے سورج کی روح پرور لالی اور رات کی سیاہی میں گھلی چاندنی...... کاش میں شاعر ہوتا یا کوئی کہانی کار تب تمہیں اس کے حسن کے بارے میں صحیح خاکہ کھینچ کر دکھا سکتا۔‘‘

’’اوہ!‘‘ پنوں حیران ہوا۔ ’’اسامہ اتنا کچھ کہنے کے بعد بھی تمہیں اپنے شاعر یا کہانی نویس ہونے کا ملال ہے۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ کیا واقعی، وہ اتنی ہی حسین ہے؟‘‘

’’اس سے کہیں بڑھ کر۔‘‘ اسامہ نے پریقین لہجے میں کہا۔ ’’اس کی آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی ہے۔ اس کی پلکیں لمبی گھنی اور نوکیلی ہیں جو دل میں پیوست ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کی پیشانی چودھویں کے چاند کی طرح دمکتی ہوئی ہے۔ اس کے رخسار تازہ وشگفتہ پھولوں کی طرح نرم اور شاداب ہیں۔ لب، نوخیز کلیوں کے سے مہکتے ہوئے...... اور......‘‘

’’بس...... اتنا کافی ہے۔‘‘ پنوں نے اپنے سینے پر دل کے مقام پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے تاب لہجے میں کہا۔ ’’اس کے حسن کی اتنی تعریف سن کر میں بے خود و بے کل ہوگیا ہوں۔ مزید کچھ سننے کی مجھ میں تاب نہیں۔‘‘

’’پنوں! تم ٹھیک تو ہو۔‘‘ اسامہ نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے حیرت سے سوال کیا۔ ’’تمہارے چہرے کا رنگ متغیر اور آنکھوں میں عجب سی مسحور کن کیفیت نظر آرہی ہے۔ لگتا ہے تم سسّی کے حسن کے قصے سن کر اس پر دل وجان سے فدا ہوگئے ہو۔‘‘

پنوں نے اپنے لبوں سے کچھ نہ کہا۔ مگر اس کی آنکھیں اس کے دل کا حال بیان کر رہی تھیں۔ اسامہ کی باتوں کا اس کے دل پر ایسا اثر ہوا تھا کہ اسے خود اپنی دھڑکنوں کا انداز نیا اور انجانا سا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ تمام رات اس انجانی اَن دیکھی سسّی کے سپنے دیکھتا رہا۔ اس کے دل نے اسامہ کی بتائی ہوئی باتوں کی مدد سے سسّی کے حسن کا ایک پیکر اپنے تصور میں تراش لیا تھا۔

اور اب پل پل اس پیکر کو تکتا اور بے چین وبے کل رہتا۔ نہ راتوں کو نیند تھی نہ دن کو قرار...... لمحہ بہ لمحہ اس کی بے قراری اور تڑپ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کی حالت اس کے گھر والوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ وہ اپنے باپ کا بے حد لاڈلا اور چہیتا بیٹا تھا۔ سب سے چھوٹا ہونے کے ناتے اس کے تینوں بڑے بھائی اس سے بے حد محبت کرتے تھے اور اس کی ماں تو اس کا چہرہ دیکھ کر ہی جیتی تھی۔

پنوں کی بے چینی اور پریشانی نے سب کو پریشان کردیا تھا۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کیوں بے کل و مضطرب ہے، مگر سب اس کے اضطراب سے بے کل و مضطرب تھے۔ انہوں نے پنوں سے بہت پوچھنا چاہا، مگر وہ کیا بتاتا؟ چنانچہ اس کی ماں نے اس کے دوستوں سے سن گن لینے کا فیصلہ کیا اور ایک شام اس کے سب سے قریبی دوست اسامہ کو بلا بھیجا۔

’’اسامہ! تم پنوں کے سب سے اچھے دوست ہو، یقیناً تم بتاسکو گے کہ آج کل وہ اتنا الجھا ہوا اور بے کل کیوں رہتا ہے؟‘‘ پنوں کی ماں نے نرم اور متفکر لہجے میں سوال کیا۔

اس کے سوال پر اسامہ سٹپٹا اٹھا تھا کیونکہ وہ پنوں کی بے قراری و بے تابی کا سبب اچھی طرح جانتا تھا۔ شروع میں اس نے سوچا کہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ پنوں سب کچھ بھول بھال جائے گا...... مگر ایسا نہ ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی دیوانگی اور وارفتگی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے افسوس ہوتا تھا کہ آخر اس نے پنوں کے سامنے سسّی کا ذکر کیا ہی کیوں؟‘‘

کاش وہ جانتا کہ اس کا ذکر سن کر پنوں اس کا دیوانہ ہوجائے گا تو وہ یقیناً اس کا تذکرہ نہ کرتا...... مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ کمان سے تیر اور منہ سے بات نکلنے کے بعد واپس نہیں آسکتی۔ اب اسے اس کے تدارک کے بارے میں کچھ سوچنا تھا۔ سو اس نے اس پریشانی کا حل یہ نکالا کہ اگر پنوں بھنبھور جاکر ایک بار سسّی کو دیکھ لے تو شاید اس کی دیوانگی رفع ہوجائے، چنانچہ اس نے اس کی ماں سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے کہ اس کی یہ بے قراری، بے کاری کے سبب ہے۔ اس کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس عمر میں خون میں گرمی ہوتی ہے اور انسان کا ولولہ اور جذبہ جوان ہوتا ہے۔ وہ کچھ کر دکھانا چاہتا ہے۔ میری مانیئے تو اسے میرے ساتھ ایک تجارتی سفر پر جانے کی اجازت دے دیجئے۔ کچھ سفر کرے گا، دنیا دیکھے گا۔ قافلے میں موجود بھانت بھانت کے لوگوں سے ملے گا تو اس کے اس جذبے کی تسکین ہوگی۔‘‘

اسامہ کی رائے نہایت صائب اور مشورہ بے حد عمدہ تھا، جسے پنوں کے بھائیوں نے بھی پسند کیا، مگر اس کا باپ پریشان ہوگیا۔

’’تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ پنوں کے بغیر میں کس طرح زندہ رہ سکوں گی۔‘‘

’’خدانخواستہ وہ کوئی ہمیشہ کے لئے تو نہیں جارہا۔‘‘ اس کی ماں نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ’’چند دنوں کی بات ہے۔ اسامہ کے ساتھ جاکر، کچھ گھوم پھر کر واپس آجائے گا۔ اس کے لئے یہی بہتر ہے۔‘‘

پنوں کا باپ شاہ امام، تذبذب کا شکار ہوگیا۔ وہ پنوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کے بغیر چند دن گزارنے بھی اس کے لئے مشکل تھے...... مگر سب کے سمجھانے اور اپنے چہیتے کی بھلائی کے خیال سے آخر بڑی مشکل سے وہ رضامند ہوگیا تھا۔

اب اسامہ نے یہ خوش خبری پنوں کو سنائی۔ ’’خوش ہوجاؤ۔ ہم اگلے سوموار کو بھنبھور کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ تم دل بھر کر اپنی اَن دیکھی انجانی محبوبہ کا دیدار کرلینا۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ پنوں کے حیرت سے سوال کرنے پر اسامہ نے سارا احوال اس کے گوش گزار کردیا۔

’’اوہ اسامہ، میرے دوست میرے بھائی۔‘‘ پنوں فرطِ مسرت سے اسامہ سے لپٹ گیا۔ ’’مجھے یقین نہیں آرہا، کیا ایسا ممکن ہوگا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس پیکرِ حسن اس مہ لقا، اس پری وش سسّی کو دیکھ سکوں گا۔‘‘

سوموار کو طلوع آفتاب کے ساتھ ہی پنوں، اسامہ اور اپنے چند دیگر دوستوں کے ساتھ ایک قافلے میں شامل ہوکر بھنبھور کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس کے والدین نے زادِ راہ کے طور پر اسے اشرفیوں سے بھری کئی تھیلیاں تھمادی تھیں۔ اسامہ کافی مقدار میں مشک اور عطریات بھی ساتھ لے لیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ دور دراز کے علاقوں میں پردیسیوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے انہیں نکمے نوجوانوں کی بجائے مشک وخوشبویات کے تجار کی حیثیت سے سفر کرنا چاہئے۔ ویسے بھی اس کے باپ کا یہی کاروبار تھا اور اسے اس کی تجارت کا خاصا تجربہ بھی تھا۔

کئی روز کے سفر کے بعد آخر قافلہ بھنبھور میں جاٹھہرا۔ سفر کے دوران پنوں کا شوق اور تجسس دوچند ہوگیا تھا۔ جوں جوں منزل قریب آرہی تھی، اس کا جنوں بڑھتا جارہا تھا۔

آخرکار وہ شہر آگیا جہاں اس کے خوابوں کی شہزادی کا بسیرا تھا۔ ہواؤں میں اس کے وجود کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ فضاؤں کی رعنائی میں اس کے حسن کا پرتو گھلا تھا۔ ہوا کی آہٹوں میں اس کی ریشمی پازیب کی کھنک بسی تھی۔ چہار سُو اس کی نقرئی آواز کا جل ترنگ بج رہا تھا۔

قافلے کے بھنبھور میں پڑاؤ انداز ہونے کے ساتھ ہی پورے شہر میں خبر پھیل گئی کہ دور دیس سے کچھ نوجوان تاجر مشک وعطریات کے ساتھ آئے ہیں۔

’’کچھ سنا تو نے سسّی۔‘‘ سسّی کی ایک ہم عمر اور ہم مذاق سہیلی بچائی نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ’’اپنے بھنبھور میں کچھ نوجوان تاجر مشک اور خوشبو لے کر آئے ہیں۔ سب کے سب گھبرو جوان ہیں۔ مگر ایک نوجوان کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ سچ کہوں پورا شہزادہ لگتا ہے۔‘‘

’’تجھے کیسے پتہ؟‘‘ سسّی نے حیرت سے سوال کیا۔

’’تجھے تو پتہ ہے نا، تیری طرح مجھے بھی مشک وخوشبویات کا کتنا شوق ہے۔ کل میں صاحبی کے ساتھ مشک خریدنے قافلے میں گئی تھی۔ وہیں چاروں کو دیکھا۔ پر پنوں کی تو بات ہی کچھ اور ہے؟‘‘

’’پنوں؟‘‘ اس نام میں جانے کیسی تاثیر تھی کہ سسّی بے ساختہ چونک اٹھی۔ ’’تمہیں یہ نام کس نے بتایا؟‘‘

وہیں وہ سب ایک دوسرے کو مخاطب کر رہے تھے۔ تب ہی پتہ چلا کہ ان سب میں جو سب سے خوبرو، وجیہہ اور شکیل لڑکا ہے، اس کا نام پنوں ہے...... سچ کہوں وہ تو کسی ملک کا شہزادہ لگتا ہے۔‘‘

’’تُو مشک خریدنے گئی تھی یا شہزادہ دیکھنے گئی تھی؟‘‘ سسّی نے آنکھیں نکال کر مصنوعی غصے سے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ’’گئی تو مشک ہی خریدنے تھی، مگر...... خیر تو بتا تو کب چلے گی۔ آخر تجھے بھی تو خوشبو پسند ہے نا؟‘‘

’’ہاں مگر پہلے سے ہی میرے پاس کئی عطر موجود ہیں۔ البتہ تو معلوم کر ان تاجروں کے پاس ختن کا مشک ہے، تو پھر سوچا جاسکتا ہے۔‘‘

’’ختن کا مشک، یہ کیسا ہوتا ہے؟‘‘ بچائی نے حیرت سے پوچھا۔

’’بابا کہتے ہیں، ملک چین کا ایک علاقہ ہے ختن، وہاں کا مشک بے حد مشہور ہے۔ اس علاقے میں ایک سیاہ رنگ کا ہرن پایا جاتا ہے، اس کے نافے میں سرخی مائل سیاہ رنگ کی ایک تھیلی ہوتی ہے۔ مشکِ ختن دنیا کی سب اعلیٰ اور عمدہ خوشبو ہوتی ہے۔‘‘

’’مجھے یقین ہے پنوں کے پاس مشک ختن ضرور ہوگا۔‘‘ بچائی نے پُریقین لہجے میں کہا اور پنوں کے نام پر سسّی کو ایک بار پھر اپنی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا محسوس ہوا تھا۔

’’لگتا ہے تم اس مشک کے سوداگر سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی ہو؟‘‘ سسّی نے مسکرا کر قدرے شوخ لہجے میں کہا۔ ’’اب تو اس شہزادے نما سوداگر سے مشک خریدنی ہی پڑے گی۔‘‘

’’ہاں بھئی تم مشک خرید سکتی ہو، کھیا کی اکلوتی بیٹی ہو۔ بھلا تمہیں روپے پیسے کی کیا کمی؟ کمی تو ہم جیسوں کے لئے ہے، خریدنا چاہیں بھی تو نہیں خرید سکتے۔‘‘ بچائی کے افسردہ سے لہجے میں کہنے پر سسّی نے آگے بڑھ کر اسے پیار سے گلے لگاتے ہوئے میٹھے لہجے میں کہا۔

’’تو پگلی دل چھوٹا کیوں کرتی ہے۔ میں جتنی مشک خریدوں گی، اس میں سے آدھی تم لے لینا۔‘‘

بچائی، بچوں کی طرح کھل اٹھی۔

اگلے دن وہ قافلے میں پہنچی تو پتہ چلا کہ قافلہ تو اگلے شہر کے لئے روانہ ہوچکا ہے۔

’’اور وہ...... مشک کے سوداگر؟‘‘ اس نے پریشانی بھرے انداز میں سوال کیا۔

’’ہاں ہاں...... وہ سوداگر سامنے والی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، جاکر دیکھ لو۔ پوری سرائے میں خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں۔‘‘

بچائی فوری طور پر سسّی کے پاس پہنچی اور تیز تیز لہجے میں بولی۔ ’’سسّی اگر واقعی تمہیں مشک خریدنی ہے تو ابھی اسی وقت میرے ساتھ سرائے تک چلو۔ ورنہ کچھ پتہ نہیں یہ سوداگر کب دوسرے شہر کو چل دیں۔‘‘

’’کون سوداگر؟‘‘ سسّی حیران ہوئی۔

’’ارے بھول گئی؟‘‘ بچائی نے حیرت سے پلکیں پٹ پٹائیں۔ ’’ارے وہی مشک وعنبر والے سوداگر...... وہی پنوں؟‘‘

’’اچھا...... وہ پنوں۔‘‘ سسّی نے شریر لہجے میں کہا۔ ’’آج تو اس کا ٹھور ٹھکانہ بھی معلوم کرآئی۔ سچ بتا بچائی کچھ دال میں کالا تو نہیں؟‘‘

’’تُو تو جانتی ہے سسّی، میری شادی ہونے والی ہے۔‘‘ بچائی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ’’اور مجھے اپنے مرد سے زیادہ کوئی نہیں بھاسکتا۔‘‘ پھر ذرا رک کر شوخ لہجے میں بولی۔ ’’ہاں البتہ اگر تجھے پسند آجائے تو میں اسے اپنا بہنوئی بناسکتی ہوں۔‘‘

’’اری آہستہ بول...... کم بخت مجھے بدنام کرے گی کیا؟‘‘ سسّی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’کسی نے سنا تو شامت آجائے گی۔‘‘

’’شامت کی کیا بات ہے۔ تجھے کسی نہ کسی سے تو شادی کرنی ہی ہے نا؟‘‘ بچائی نے مصنوعی غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ ’’اور اگر شادی کرنی ہے تو پھر کوئی دھوبی ہی کیوں...... پنوں جیسا شہزادہ کیوں نہیں؟‘‘

’’تُو تو اتنے یقین سے کہہ رہی ہے کہ جیسے واقعی وہ کوئی شہزادہ ہے۔‘‘ سسّی قدرے طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

’’شہزادہ ہے کہ نہیں یہ تو معلوم نہیں۔‘‘ بچائی نے دونوں ہاتھ کاندھے تک اٹھا کر کہا۔ ’’مگر لگتا بالکل کسی شہزادے جیسا ہی ہے۔‘‘

’’اچھا چھوڑ یہ سب باتیں، بتا مشک خریدنے کب چلنا ہے؟‘‘ سسّی نے پوچھا۔

’’میں تو کہہ رہی ہوں کہ اس سے پہلے کہ وہ کسی اور شہر کو چل دے، ہمیں آج بلکہ ابھی چل کر مشک خرید لینی چاہئے۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... آؤ بابا سے پوچھ لیتے ہیں اور چلتے ہیں۔‘‘ سسّی نے اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’ان سے پیسے بھی تو لینے ہیں۔‘‘

کھیا محمد کی اچھی آمدنی تھی۔ وہ جو کچھ کماتا تھا، اس میں سے کچھ مہمان نوازی پر خرچ کرتا تھا۔ باقی سب کچھ سسّی کے لئے تھا۔ سسّی دل کھول کے شاہانہ انداز سے خرچ کرتی اور جو چاہتی خریدتی۔ البتہ سکینہ کبھی کبھی سمجھاتی اور کہتی کہ کل کلاں کو بیٹی کی شادی بھی کرنی ہے۔ تم دونوں باپ بیٹی مل کر اسی طرح اللے تللے کرتے رہے تو سسّی کے بیاہ کے لئے جہیز اور دیگر اخراجات کا کیا بنے گا؟‘‘

’’وہ وقت آنے دے۔‘‘ محمد مسکرا کر جواب دیتا۔ ’’اللہ سب کردے گا۔‘‘

سسّی پیسے اور اجازت لے کر بچائی کے ساتھ پنوں کے سرائے کی طرف چل دی۔ دوپہر ڈھل کر سہ پہر سے گلے مل رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت اور تیزی میں قدرے کمی آگئی تھی۔ سرائے کی سمت جانے والے راستے کے اطراف کھڑے گھنے پیڑ ہلکی ہوا میں دھیرے دھیرے جھوم رہے تھے۔ بچائی، سسّی کا ہاتھ تھامے پیڑوں کی چھاؤں میں تیزی سے سرائے کی جانب بڑھی جارہی تھی۔ گو کہ اب بھری دوپہر والی تپش نہ تھی۔ پیڑوں تلے سایہ اور ٹھنڈک تھی مگر اس کے باوجود سسّی کی صندلی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔

’’ہم نے غلطی کی، ہمیں شام کے وقت گھر سے نکلنا چاہئے تھا۔‘‘ سسّی نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے پچھتاوے بھرے لہجے میں کہا۔

’’ہاں مگر کیا کرتے؟‘‘ بچائی شریر لہجے میں بولی۔ ’’تمہیں تو پنوں سے ملنے کی ایسی جلدی تھی کہ......‘‘

’’چھی۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔‘‘ سسّی نے بھنویں سکیڑ کر بچائی کی طرف دیکھا۔ ’’مجھے کیوں ہونے لگی کسی پرائے مرد سے ملنے کی جلدی...... میں تو بس مشک خریدنے جارہی ہوں۔‘‘

بچائی نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ بس رفتار بڑھادی۔ وہ دونوں اسی طرح چلتی ہوئی سرائے تک پہنچ گئی تھیں۔

اس وقت سرائے کے ٹھنڈے اور پُرسکون کمرے میں اسامہ اور اس کے بقیہ دونوں دوست لیٹے ہوئے تھے، مگر پنوں کمرے میں نہ تھا۔ جب سے وہ سسّی کے شہر بھنبھور پہنچا تھا، اس کی بے چینی اور بے قراری کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ کئی بار اسامہ سے کہہ چکا تھا کہ کیوں نہ ہم خود سے کھیا محمد کے گھر چلیں؟ مگر اسامہ نے اسے سمجھایا تھا کہ اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔ دو چار روز انتظار کرتے ہیں، شاید وہ خود ہی ہمیں مدعو کرے، ورنہ کوئی اور راستہ نکالیں گے۔

مگر پنوں کو تاب انتظار کب تھا۔ اس کی بے کلی اور تڑپ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ کبھی بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا تو کبھی سرائے کے دروازے پر جابیٹھتا اور آتے جاتے لوگوں کا چہرہ تکتا رہتا۔ اسے امید تھی کہ شاید کبھی سسّی اس راستے سے گزرے اور وہ اس کا دیدار کرے۔

’’مگر اس طرح تم سسّی کو پہچانو گے کس طرح؟‘‘ اس کے ایک دوست نے پوچھا۔

’’خود اپنا تعارف ہوتی ہے ہوا بہار کی۔‘‘ پنوں نے مسکرا کر کہا۔ ’’بھلا چاند کو بھی پہچاننے کے لئے کسی دقت کی ضرورت ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے میرا دل بتادے گا کہ یہ وہی مہ لقا ہے کہ جس کی تلاش میں میلوں کا سفر طے کرکے یہاں پہنچا ہوں۔‘‘

سہ پہر آہستہ روی سے شام کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ہواؤں میں قدرے تسکین اور ٹھنڈک سمٹ آئی تھی۔ ایسے میں پنوں سرائے کے داخلی دروازے پر ایک مونڈھے پر بیٹھا خالی خالی نظروں سے خالی راستے کی اور تک رہا تھا۔

تب ہی اسے سامنے کی جانب سے دو لڑکیاں آتی ہوئی دکھائی دی تھیں۔ ایک لڑکی کو اس نے دو روز قبل قافلے کے پڑاؤ انداز ہوتے وقت دیکھا تھا۔ وہ غالباً اسامہ سے مشک وغیرہ کے بارے میں معلومات کرنے آئی تھی۔ وہ بھی اس وقت وہیں موجود تھا، مگر اپنے ہی تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس ایک آدھ بار لڑکی کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا اور اندر چلا گیا تھا۔

وہ دونوں لڑکیاں تیزی سے چلتی اب کچھ اور قریب آگئی تھیں۔ پنوں نے کل والی لڑکی بچائی سے نظریں ہٹا کر اس کے ساتھ آنے والی لڑکی سسّی کی جانب دیکھا۔

اور اگلے ہی لمحے بے تابانہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سینے میں دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور نبض کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ پورا وجود آنکھیں بن گیا تھا اور اس پل اس کی آنکھیں سسّی کے دلکش ورعنا چہرے پر جمی تھیں۔

سسّی، بچائی کے ساتھ چلتی داخلی دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ تب ہی اسے اپنے چہرے پر کسی کی نظروں کی تپش محسوس ہوئی اور اس نے بے ساختہ اس شخص کی طرف دیکھا جس کی نظریں مسلسل اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

پنوں اس پل اس کی جانب تک رہا تھا۔ لحظہ بھر کو ان دونوں کی نظریں ٹکرا گئی تھیں۔ نظروں کا یہ تصادم ایک تحیر خیز سنسناہٹ بن کر دونوں ہی کے رگ وپے میں اتر گیا تھا۔

سسّی اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی اور اس کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے مدھم پڑ گئی تھیں اور نظریں پنوں کے وجیہہ وشکیل چہرے پر جمی تھیں۔

وہ دونوں قرب وجوار سے بے نیاز، بے خود ومدہوش، بس ایک دوسرے کو تکے جارہے تھے۔

ان کی آنکھوں میں برسوں کی شناسائی اور اپنا پن تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو جنم جنم سے جانتے ہوں۔ (جاری ہے)

سسی کو وہ اجنبی شخص بالکل انجانا نہ لگا تھا اور پنوں اسے پچھلے کئی مہینوں سے اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھا کے پوجتا رہا تھا۔ اسامہ سے سسی کا تذکرہ سن کر اس کے خیال نے جو پیکر تراشا تھا وہ ہو بہو ویسی ہی تھی۔ سیاہ گھنی ریشمی دراز زلفیں، چشمِ غزال کی سی آنکھیں، گل کی مانند گداز و معطر لب و عارض۔ صراحی دار نازک گردن، پھولوں بھری شاخ کی مانند لچکتے بازو، مخروطی انگلیاں، نازک و حسین ہاتھ، سانچے میں ڈھلا قیامت خیز سراپا، سیاہ چندری میں اس کا صبیح چہرہ، بادلوں کی بیچ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے سیاہ ڈھیلے ڈھالے کرتے پر سرخ و زرد دھاگے سے بھرت کی کڑھائی تھی، سوسی کی گھیر دار شلوار اور سرخ پھندنے والے گرگابی میں اس کے نرم و گلابی پاؤں بے حد بھلے معلوم دے رہے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے چہرے پر نظریں جمائے بے خود سے کھڑے تھے۔ بچائی حیرانی اور پریشانی سے ان دونوں کو تکے جا رہی تھی۔ تب ہی کوئی پرندہ قریبی پیڑ سے اُڑا تھا یا شاید کسی نے زور سے دروازہ کھولا تھا، ایک آہٹ ہوئی تھی۔ ایک آہنگ پیدا ہوا تھا جس نے ان دونوں کا انہماک توڑ دیا تھا۔ وہ دونوں چونک کر سیدھے ہوئے تھے اور حیران نظروں سے اپنے اطراف تک رہے تھے۔

‘‘سسی کیا ہوا...... خیر تو ہے۔’’ بچائی نے سسی کو ٹہوکا دیتے ہوئے پوچھا۔

‘‘سسی۔’’ پنوں کے لبوں پر یہ شہد آگیں نام مچلا۔ ‘‘تمہیں دیکھتے ہی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم یقیناً سسی ہو......’’

‘‘اور...... تم...... پنوں؟’’ سسی نے اپنا قدم آگے بڑھ کر خواب کے سے لہجے میں سوال کیا۔

‘‘ہاں سسی۔’’ پنوں بھی دو قدم آگے بڑھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ان کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے اور مہکتی سانسیں ایک دوسرے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ ‘‘میں پنوں ہوں، اپنی سسی کا دیوانہ...... سچ سسی جب سے میں نے تمہارے بارے میں سنا تمہارے علاوہ کچھ اور نہیں سوچا اور آج اس پل تمہیں دیکھنے کے بعد ان آنکھوں کو اب کچھ اور دیکھنے کی تمنا نہیں رہی...... ڈھونڈ رہی تھیں جانے کب سے تیری صورت میری آنکھیں۔’’

سہ پہر کا وقت تھا، گرمی کا موسم اس لئے ہر جانب سناٹا اور سکوت تھا۔ اگر ارد گرد لوگ ہوتے تو ان دونوں کی باتیں سن کر ششدر رہ جاتے اور جانے کیا قیامت اٹھاتے۔ مگر یہ ان دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں اس وقت بچائی کے سوا کوئی نہ تھا اور بچائی بھی حیرت کی تصویر بنی ان دونوں کو تکے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس موقع پر ان لوگوں سے کیا کہے، کیا نہ کہے؟

آخر اس نے آگے بڑھ کر سسی کو ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ‘‘سسی! جانتی بھی ہو...... کیا کہہ رہی ہو اور کیا سن رہی ہو؟’’ مگر سسی کی جانب سے جواب نہ پا کر وہ پنوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

‘‘اے بھائی پنوں، تمہیں احساس ہے، تم کیا کہے جا رہے ہو؟ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے اور پہلے تم یہ بتاؤ تم سسی کا نام کس طرح جانتے ہو؟’’

‘‘اندر چلو میں تمہیں سب بتاؤں گا۔’’ پنوں نے ملتجی لہجے میں کہا اور بچائی خاموشی سے سسی کا ہاتھ تھامے اس کے پیچھے چل دی تھی۔ پنوں انہیں لے کر سرائے کے اس کمرے میں چلا آیا جو مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا جس کے فرش پر ایک عنابی، نیلی اور دھانی رنگوں سے بُنی دری بچھی تھی اور سامنے رنگین پایوں والی ایک اونچی کھاٹ تھی اور دائیں بائیں سرکنڈوں سے بنے مونڈھے رکھے تھے جن پر اجرک کا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔

پنوں، بچائی اور سسی کو لئے مونڈھوں پر آ بیٹھا اور اس نے پوری سچائی کے ساتھ اسامہ کی زبانی سسی کا ذکر سننے سے لے کر اپنی بے چینی و بے تابی اور آخر کار بھنبھور تک کے اس سفر کا تمام احوال کہہ سنایا۔ بچائی کے ساتھ سسی اس کی یہ باتیں حیرت سے آنکھیں پھاڑے منہ کھولے سن رہی تھی۔

‘‘کک کیا واقعی...... ایسا ہی ہے؟’’ ساری کتھا سننے کے بعد بچائی نے ہکلاتے ہوئے حیران لہجے میں سوال کیا۔

‘‘ہاں، بچائی...... یہ سب کچھ اتنا ہی سچ ہے جس طرح ہم اس وقت ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔’’

‘‘مگر ذرا سوچو۔’’ بچائی نے گلا صاف کرتے اور خشک لبوں پر زبان پھیرتے دھیمی آواز میں کہا۔ ‘‘یہ سب باتیں اچھی نہیں...... لوگ سنیں گے تو بڑی بدنامی ہوگی...... تم سسی کو دیکھنا چاہتے تھے...... تم نے اسے دیکھ لیا۔ بہتر ہوگا کہ اب تم واپس اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ پھر وہ سسی کی طرف مڑی۔ ‘‘آؤ سسی ہم بھی چلیں۔’’

‘‘مگر...... وہ مشک۔’’ سسی نے ابھی کچھ دیر اور یہاں ٹھہرنا چاہتی تھی، اس لئے اس نے مشک کی یاد دہانی کروائی تا کہ اس بہانے چند لمحے اور مل جائیں۔

‘‘ہم مشک لینے آئے تھے مگر یہاں عشق کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور تم جانتی ہو، کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم ان دونوں سے دور رہو۔’’ اس نے سسی کا ہاتھ پکڑا اور واپسی کیلئے مڑ گئی۔

‘‘ارے ذرا سنو تو......’’ پنوں گھبرایا ہوا پیچھے لپکا۔ ‘‘بچائی ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو...... ذرا سنو تو۔’’

مگر بچائی کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ وہ سسی کا ہاتھ پکڑے تیزی سے سرائے سے باہر نکل آئی۔ پنوں ان دونوں کے پیچھے کھنچا چلا آ رہا تھا۔

‘‘پنوں......’’ بچائی چند قدم چل کر رک گئی۔ ‘‘تم شکل و صورت سے کسی اچھے گھر کی اچھے خاندان کے فرد لگتے ہو، پھر یہ بازاری عاشقوں کی سی حرکت کیوں کر رہے ہو۔ اگر تم اسی طرح ہمارے پیچھے چلتے رہے تو لوگ کیا کہیں گے۔ کیا تم سسی کو بدنام کرنا چاہتے ہو۔’’

‘‘ہرگز نہیں۔’’ پنوں نے پُر زور لہجے میں کہا۔ ‘‘میں تمہیں اور سسی کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اس طرح روٹھ کر چلی گئی تو میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔’’

بچائی نے حیران نظروں سے اس حسین و جمیل باوقار و شاندار نوجوان کو دیکھا جس کے لہجے میں ایسی سچائی تھی کہ اس کا پتھر دل پسیج گیا۔

‘‘چلو ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو سنو ہم روٹھ کر نہیں جا رہیں، اب تم پیچھے مت آؤ، ابھی ہمیں جانے دو، سوچیں گے...... اور اگر ضروری سمجھا تو ہم مشک لینے پھر آئیں گے۔’’

‘‘وعدہ کرو۔’’ پنوں، سسی سے مخاطب تھا۔ ‘‘وعدہ کرو سسی تم مجھ سے ملنے دوبارہ ضرور آؤ گی۔’’

اس کے لہجے میں التجا اور ایسی تڑپ تھی کہ سسی تو کیا، خود بچائی کا دل بھی تڑپ اٹھا۔

‘‘ٹھیک ہے۔’’ سسی کی بجائے بچائی نے جواب دیا۔ ‘‘اس وقت ہمیں جانے دو...... کل کسی وقت ہم تم سے ملنے آئیں گے۔’’

پنوں اپنی جگہ تھم گیا اور بچائی سسی کا ہاتھ تھامے تیزی سے گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ سسی خاموشی اور بے بسی کی تصویر بنی بچائی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ پورے راستے اس نے کوئی بات نہ کی۔ بچائی بھی خاموش تھی، اسی طرح راستہ کٹ گیا اور گھر آ گیا۔

‘‘مجھے دیر ہو رہی ہے، ماں پریشان ہو رہی ہوگی، اب میں اپنے گھر جاتی ہوں۔’’ بچائی اسے اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر خود اپنے گھر کیلئے روانہ ہو گئی۔ سسی نے اس کی طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں اور آہستگی اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔

چند لمحوں میں دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل جب وہ گھر سے نکلی تھی تو کس قدر خوش، شاداب اور زندگی سے بھرپور تھی اور اب جب وہ گھر میں داخل ہوئی تھی، خود کو کس قدر خالی خالی محسوس کر رہی تھی۔ ایک ادھورے پن کا احساس ہو رہا تھا، لگ رہا تھا کوئی قیمتی چیز کہیں کھو گئی ہے۔ وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پنوں کے چہرے پر رہ گئی تھیں، اور وہ اپنا دل پنوں کے قدموں میں چھوڑ آئی تھی۔ سماعت صرف پنوں کی سحر انگیز آواز سننے کیلئے وقف ہو گئی تھی اور قوت گویائی گویا وہیں کہیں کھو گئی تھی۔

‘‘کیا بات ہے سسی، بہت چپ چپ ہو، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟’’

اس کے باپ کھیا محمد نے اسے یوں گم صم دیکھا تو پریشانی سے سوال کیا۔ ‘‘تم مشک لینے گئی تھیں، پر لگتا ہے روپے کہیں کھو کر آ گئی ہو۔’’

‘‘ہاں کچھ کھو تو گیا ہے۔’’ سسی نے من ہی من میں سوچا۔ ‘‘مگر روپے نہیں...... کوئی اور بیش بہا اور بیش قیمت شے...... مگر وہ کیا ہے؟

‘‘ماں صدقے کیا ہوا میری لاڈلی کو؟’’ سکینہ لپکتی ہوئی آگے بڑھی۔ ‘‘روپے کھو گئے تو اس میں اتنا اداس ہونے کی کیا بات ہے، سمجھ لے تیرا صدقہ تھا۔’’

‘‘نہیں ماں روپے تو موجود ہیں۔’’ اس تمام عرصے میں سسی نے پہلی بار زبان کھولی اور اسے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ کیسی عجیب ملاقات تھی کہ اس اجنبی سے مل کر وہ خود سے انجانی ہو چلی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ہر سمت شام کے سرمئی سائے بکھر گئے، پھر رات کی سیاہی نے شام کے سرمئی سلونے رنگ کو ڈھانپ لیا۔ مگر سسی کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ آئی، اسے جو چپ لگی تھی سو لگی رہی۔ اس سے کھانا نہ کھایا گیا۔ بستر پر لیٹی تو نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، کئی لمحوں تک وہ آنکھیں کھولے نیلے آکاش کے ماتھے پر دمکتے چاند کے طلائی جھومر کو تکتی رہی تھی۔ ننھے منے ٹمٹماتے تارے پلکیں جھپک جھپک کر اسے حیرانی سے تک رہے تھے۔ وہ کھاٹ پر لیٹی بے چینی و بے کلی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ آخر تھک کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آنکھیں بند کرتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے وہ وجیہہ و شکیل چہرہ آ گیا تھا، وہ بولتی آنکھیں وہ مسکراتے لب۔

‘‘اُف۔’’ سسی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ساری رات اسی طرح کرب و اضطراب میں گزر گئی تھی۔ اگلی صبح تڑکے ہی وہ بچائی کی طرف چل دی۔

بچائی اسے یوں صبح صبح اپنے گھر دیکھ کر حیران ہوئی اور اس بات سے زیادہ اسے سسی کی حالت پر حیرت تھی۔ اس کی آنکھوں کو سرخی اس کے شب کی بیداری کا قصہ سنا رہی تھی۔ اترا چہرہ، بکھری زلفیں، اس کے اضطراب کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ ایک ہی رات میں کس قدر بدل گئی تھی۔ اب وہ پہلے والی سسی رہی ہی نہیں تھی، وہ ہنستی مسکراتی شوخ و چنچل سسی وہیں سرائے کے آس پاس کہیں کھو گئی تھی...... یہ سسی تو برہا کی ماری، تنہائی کے درد کی ستائی اور محبوب سے دوری کے دکھ میں مبتلا ایک حرماں نصیب لگ رہی تھی۔

‘‘سسی خیر تو ہے، تجھے کیا ہوا، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟’’ اسے اس حال میں دیکھ کر بچائی ایک دم گھبرا گئی...... ‘‘بولتی کیوں نہیں، تجھے کیا ہوا ہے؟’’

‘‘یہی تو میں تجھ سے پوچھنے آئی ہوں۔’’ سسی نے کرب بھرے لہجے میں کہا۔ ‘‘کل شام کے بعد سے اب تک مجھے کسی کروٹ چین نہیں ہے۔ عجب بے کلی اور بے تابی ہے، لگتا ہے سینہ خالی خالی ہے، کوئی شے کھو گئی ہے، آنکھیں بند کرتی ہوں تو...... تو......’’

‘‘بول سسی۔’’ بچائی اس کی کیفیت غور سے سن رہی تھی، اس کے چپ ہوتے ہی دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔ ‘‘آنکھیں بند کرتی ہے تو کیا نظر آتا ہے؟’’

‘‘اس...... اس...... اجنبی کا چہرہ۔’’ سسی نے نگاہیں جھکا کر بے بسی کے ساتھ آخر سچائی کا اعتراف کر ہی لیا۔

بچائی کئی لمحوں تک سسی کو خاموش نگاہوں سے تکتی رہی، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پنوں کے بے پناہ اور دیوانہ وار جذبوں نے ایک ہی جست میں سسی کے دل تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ وہ دیوانہ سا لڑکا جو سسی کی خیالی تصویر بنا کر اس کی تلاش میں اپنا گھر بار، اپنا شہر، وطن چھوڑ کر مسافت کی خاک چھانتا یہاں تک آ پہنچا تھا...... اس کی لگن اتنی بے مایہ تو نہیں ہو سکتی تھی، اس کا جذبہ اتنا بے وقعت کیونکر ہو سکتا تھا کہ سسی کے دل پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس کے وجود کو بھسم کرتی چاہت اور طلب کی آگ سسی کے دامن دل تک آ پہنچی تھی۔ اس کی دیوانگی اور آشفتہ سری نے سسی کے دل پر یوں وار کیا تھا کہ وہ اپنی مسکراہٹ، اپنی شگفتگی، اپنی ہنسی، اپنا دل، اپنا وجود سب کچھ اس انجانے اجنبی شخص پر وار آئی تھی۔ اسی لئے وہ خود کو ادھوری سی، خالی خالی محسوس کر رہی تھی۔

مگر وہ عشق کی اس شعبدہ بازی اور معجزہ آرائی کے ادراک سے محروم تھی، وہ اس سچائی سے نابلد تھی کہ وہ شہر عشق کی باسی بن چکی ہے اور پہلی ہی نگاہ میں پنوں نگاہوں کی راہ سے اس کے دل ہی میں نہیں، روح میں بھی اتر گیا ہے۔

‘‘سسی کیا واقعی تو نہیں جانتی؟’’ بچائی نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے سرگوشی میں سوال کیا، پر سسی نے کچھ جواب دینے کی بجائے حیران سی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بچائی گویا ہوئی۔ ‘‘یہی کہ تجھے پہلی ہی نظر میں اس انجانے دور دیس کے باسی پنوں سے عشق ہو گیا ہے۔’’

‘‘کیا؟’’ سسی نے خائف نظروں سے بچائی کی طرف دیکھا۔ ‘‘نہیں بچائی...... ایسا کچھ نہیں ہے۔’’

پر لحظہ بھر میں اسے یہ ادراک ہو گیا تھا کہ بچائی کا تجزیہ بالکل صحیح ہے۔ محبت فیصلہ ہے اک نظر کا، کے مصداق پہلی ہی نظر میں وہ پنوں کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اس کے رگ و پے میں پنوں کی محبت سرایت کر گئی تھی۔ وہ اس کی نگاہوں میں ہی نہیں، دل میں بھی سما گیا تھا۔ اس کی دھڑکنوں میں بس گیا تھا۔ وہ اس کی سانسوں کے ساتھ چل رہا تھا اور رگوں میں لہو کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

‘‘بچائی...... یہ سب کیسے ہو گیا؟’’ اس نے بے بس نظروں سے بچائی کی سمت دیکھا۔

‘‘یہ جو ہوا سو ہوا۔’’ بچائی دھیمی آواز میں بولی۔ ‘‘اب سوچنا یہ ہے کہ آگے کیا ہوگا؟’’

‘‘میں کیا کروں، بچائی...... مجھے تو اس دن پل بھر کو قرار نہیں۔ میں اپنی اس کیفیت پر خود حیران ہوں۔’’ سسی کی حسین آنکھوں کی گہری جھیلیں گرم پانیوں سے بھر گئیں اور وہ آنچل میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

‘‘پاگل ہوئی ہے کیا؟’’ بچائی نے اسے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ‘‘روتی کیوں ہے، اس مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔’’

‘‘مشکل سی مشکل ہے۔’’ سسی نے سسکتے ہوئے کہا۔ ‘‘اس سے ملے بغیر چین نہیں اور اس سے ملنے کی کوئی سبیل نہیں۔’’

‘‘پھر ملنا تو ایسا کچھ مشکل نہیں ہے۔’’ بچائی نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔ ‘‘ہم مشک خریدنے کے بہانے آج شام کو وہاں جا سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس طرح کب تک چلے گا۔ اس مشکل کا کوئی حل ڈھونڈنا ہوگا۔’’

‘‘مستقل حل بھلا کیا ہو سکتا ہے؟’’ سسی نے آہ بھر کر پوچھا۔

‘‘یہی کہ تیری اس سے شادی ہو جائے۔’’ بچائی نے سنجیدگی سے کہا اور سسی یکبارگی اچھل پڑی۔

‘‘کیا......؟ شادی......؟ پنوں سے میری شادی؟’’ اس کے لہجے سے حیرت کے ساتھ بے یقینی بھی عیاں تھی۔

‘‘اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟’’ بچائی نے اسی سنجیدگی سے سوال کیا۔ ‘‘اب تمہاری عمر شادی کے لائق ہو گئی ہے، آج نہیں تو کل، کسی نہ کسی سے تو تمہاری شادی ہوگی ہی...... تو اس سے کیوں نہ ہو جو پہلی ہی نظر میں دل و نگاہ میں بس گیا ہے۔’’ بچائی اس دوران پہلی بار مسکرائی۔

‘‘بچائی شاید تم بھول رہی ہو، ہم دھوبیوں کی لڑکیوں کی شادی اپنی برادری میں ہی ہوتی ہے اور پنوں کا کچھ پتہ نہیں، جانے وہ کس ذات برادری کا ہے۔’’

‘‘اسی لئے تو کہتے ہیں۔’’ سسی کو دوبارہ افسردہ دیکھ کر بچائی شوخ لہجے میں بولی۔ ‘‘عشق نہ دیکھے رنگ روپ عشق نہ پوچھے ذات۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کس ذات برادری کا ہے۔ اب وہ جو بھی ہے تیرا سب کچھ اب وہی ہے۔’’

سسی نے نگاہیں جھکا لی۔ بچائی کی رائے اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ پنوں سے شادی کا خواب دیکھنا جتنا آسان تھا، اس کی تعبیر شاید اتنی ہی مشکل تھی۔

‘‘اس بات کے لئے ابھی سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔’’ بچائی نے اس کے پھول سے رخساروں سے آنسوؤں کے نشان مٹاتے ہوئے کہا۔ ‘‘ابھی صرف شام میں اس سے ملاقات کے بارے میں سوچو۔’’

کچھ دیر بیٹھ کر سسی اپنے گھر لوٹ گئی۔ اسے بڑی بے قراری سے شام ڈھلنے کا انتظار تھا مگر وقت تھا کہ جیسے تھم گیا تھا۔ لمحوں کی رفتار کم ہو گئی تھی، ساعتیں رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح کبھی کمرے میں جاتی، کبھی دالان میں ٹہلتی اور کبھی انگنائی میں لگے نیم کے گھنے پیڑ تلے، تنے سے ٹیک لگا کر جا کھڑی ہوتی۔

سکینہ اس کی حرکات و سکنات بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سسی کو جنم نہیں دیا تھا مگر ماں بن کر پالا تھا اور اسے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتی تھی۔ سسی کی بے چینی نے سے اسے بھی بے چین کر دیا تھا۔

‘‘ماں صدقے...... میرے دل کا چین، آج اتنی بے کل کیوں ہے؟’’ اس نے قریب آ کر سسی کی دمکتی صندلی پیشانی پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے ممتا بھرے لہجے میں پوچھا۔

‘‘تمہیں تو پتہ ہے ناماں کہ مجھے مشک کتنا پسند ہے۔’’ سسی نے ماں کی بے چینی دور کرنے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ‘‘کل سوداگر کے پاس مشک موجود نہیں تھا۔ آج شام اس نے منگوا کر دینے کا وعدہ کیا ہے، بس اسی کے انتظار کی تھوڑی بے قراری ہے۔’’

‘‘دھڑیں سگورو کرے کہ تیری مشک ایسی خوشبودار ہو کہ اس کی خوشبو دور دور تک پھیلے۔ رب کرے رہتی دنیا تک قائم رہے۔’’

‘‘ماسی! تم مشک کی دعا دے رہی ہو یا عشق کی۔’’ بچائی مسکراتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ ‘‘اگر مشک کی جگہ عشق کر لیں تو پتہ ہے یہ دعا کیا بنے گی۔ رب کرے تیرا عشق کامیاب ہو۔ اس عشق کو ایسی عزت اور شہرت ملے کہ رہتی دنیا تک اس کی یاد باقی رہے۔’’

‘‘پاگل ہوئی ہے، کیا کہہ رہی ہے۔’’ سسی نے بچائی کے شریر لہجے پہ اسے کہنی مارتے ہوئے سرگوشی کی مگر سیدھی سادی سکینہ کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی، بس مسکرا کر رہ گئی تھی۔

اور وہ دونوں اس سے اجازت لے کر سرائے کی جانب چل دی تھیں۔

بھنبھور کے نیلے آسمان پر اودی سرمئی بدلیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں، ہواؤں میں رِم جھِم پھواروں کی نوید بسی تھی۔ بادلوں کی رنگت نے شام کے سرمئی پرتو کو کچھ اور گہرا کر دیا تھا۔ فضاؤں میں ہر سمت ایک سرخوشی و سرشاری رچی ہوئی تھی۔ آج سسی نے پنوں سے ملنے کیلئے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ عنابی رنگ کے گوٹے کناری والے لباس میں اس کی سنہری گلابی رنگت، قیامت ڈھا رہی تھی۔ کاجل کی لکیروں نے آنکھوں کے سحر میں ہزار گنا اضافہ کر دیا تھا۔ آنکھوں میں دید کی تمنا اور ہونٹوں پر ملاقات کی دعا لئے وہ جونہی سرائے کے داخلی دروازے پر پہنچی تو دیکھا پنوں دروازے پر ہی بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔

اس کی نظر جونہی سسی پر پڑی، وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ آج سسی کا حسن کل کی نسبت ہزار گنا زیادہ قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس میں کل جو بے نیازی اور بے اعتنائی تھی آج فکر و تردد نے اس کی جگہ لے لی تھی، ہلکی سی پریشانی اور گھبراہٹ، کچھ امید و بیم کی کیفیت کیونکہ آج وہ دل کا سودا کرنے آئی تھی۔

‘‘تم سوداگر ہو یا جادوگر؟’’ اس نے خاموش نگاہوں سے شکوہ کیا، کل پہلی ہی نگاہ میں مجھ پر ایسا جادو کیا کہ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی ہوں۔’’

‘‘تم پر تو کل سے آج تک یہ کیفیت گزری ہے۔’’ پنوں نے خاموشی کی زبان میں جواب دیا۔ ‘‘مجھ سے پوچھو میں مہینوں سے اس دہکتی آگ میں سلگ رہا ہوں۔’’

پنوں، سسی کو لے کر مہمان خانے میں جا بیٹھا اور بچائی اسامہ اور دیگر لڑکوں کے پاس رک کر خوشبویات دیکھنے اور خریدنے لگی۔

مہمان خانے میں سرکنڈوں سے بنے مونڈھوں پر آمنے سامنے بیٹھے سسی اور پنوں ایک دوسرے کو بے خود سے تکے جا رہے تھے۔

‘‘سسی۔’’ چند لمحوں بعد پنوں نے سرگوشی میں اسے پکارا۔

‘‘جی!’’ سسی نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ‘‘کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟’’

‘‘مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میرے سامنے ہو، میرے خوابوں کی تعبیر اور میری محبت کی تقدیر بن کر۔’’

‘‘مگر جناب عالی، ایسا روز روز نہیں ہو سکتا۔’’ بچائی مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ‘‘اس کے لئے آپ کو کوئی مستقل راستہ کھوجنا ہوگا۔’’

‘‘میں سمجھا نہیں۔’’ پنوں نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

‘‘تم جانتے ہو یہ ایک چھوٹا شہر ہے۔ یہاں بات پھیلتے دیر نہیں لگتی، محبت کرنا گناہ نہیں ہے۔ مگر محبت کو مستقل بنیادوں پر استوار نہ کرنا گناہِ کبیرہ سے بھی بڑھ کر ہے۔’’ بچائی نے اشاروں میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سسی کی سہیلی تھی، اس ناتے وہ اپنی زبان سے براہ راست شادی کی بات کرنے سے گریزاں تھی۔ یہ تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پنوں، سسی کو بے انداز چاہتا ہے مگر اب دیکھنا یہ تھا کہ چاہنے کے ساتھ کیا وہ اپنانا بھی چاہتا تھا یا نہیں۔

‘‘میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں بچائی، بہن۔’’ پنوں پڑھا لکھا نوجوان تھا، فوری طور پر بچائی کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ‘‘آپ میری رہنمائی کریں، مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا۔ میں خود یہ چاہتا ہوں کہ گھڑی کی چوتھائی میں سسی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری ہو جائے۔’’

سسی کے گلابی رخسار شرم سے گلنار ہو گئے تھے۔ اس کی گھنی پلکوں کی ریشمیں چلمن دہکتے رخساروں پر جھک آئی تھی اور اس کا دل ایک نئے انداز سے دھڑک رہا تھا۔

‘‘شکر ہے تم فوراً ہی شادی پر راضی ہو گئے۔’’ بچائی نے دھیمی آواز اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ‘‘مجھے ڈر تھا کہ تم اتنے بڑے سوداگر ہو، کہیں تمہیں ایک معمولی دھوبی کی بیٹی سے شادی پر اعتراض نہ ہو۔’’

‘‘آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟’’ پنوں نے شکایت بھری آواز میں کہا۔

‘‘خیر اب سوچنا یہ ہے کہ یہ بیل کیسے منڈھے چڑھائی جائے۔’’ بچائی نے ایک مونڈھا قریب کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ‘‘تمہیں تو دھوبی کی بیٹی سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں مگر ہم دھوبیوں میں اپنی ہی برادری میں شادی کا رواج ہے، اب تم سے پوچھنا یہ ہے کہ تم کس ذات برادری کے ہو؟’’

اس سوال پر پنوں سٹپٹا اٹھا، پھر خود کو سنبھال کر سرسری سے لہجے میں بولا۔

‘‘میں ذات برادری کے ڈھکو سلے کو نہیں مانتا، پھر جب عشق کا معاملہ ہو تو کیسی ذات کہاں کی برادری؟’’

‘‘یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔’’ بچائی نے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ‘‘مگر جب بات بڑوں تک پہنچے گی تو یہ سوال ضرور اٹھے گا۔ بہتر ہے کہ تم کسی پس و پیش کے بغیر اپنے بارے میں سچ سچ بتا دو۔’’

پنوں کئی لمحوں تک سر جھکائے سوچتا رہا، پھر گہری سانس لے کر بولا۔

‘‘مگر پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا، میری اصلیت کا میری محبت پر کوئی اثر نہ ہوگا اور تم ہر صورت سسی سے میری شادی کروانے میں بھرپور ساتھ دو گی۔’’

‘‘پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ، وعدہ میں بعد میں کروں گی۔’’ اس کے پس و پیش نے بچائی کو شک و شبہات میں مبتلا کر دیا تھا۔

‘‘نہیں پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا۔’’ پنوں دوٹوک لہجے میں بولا۔ ‘‘میں کسی بھی قیمت اور کسی بھی طریقے سے سسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ سسی سے جدا ہو کر میں اب زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔’’

‘‘میرا بھی ایسا ہی کچھ حال ہے میرے محبوب۔’’ سسی نے اپنے سچے عاشق کی آنکھوں ہی آنکھوں میں بلائیں لیتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔ ‘‘میں تم سے ہمیشہ تو کیا چند روز کی دوری بھی برداشت نہیں کر سکتی...... کچھ بھی کرو اس فاصلے اور دوری کو قربتوں اور ہمیشہ کی سنگت میں بدل دو۔’’

‘‘ٹھیک ہے۔’’ بچائی کو زچ ہو کر وعدہ کرنا پڑا۔ ‘‘اب اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دو۔’’

‘‘میں تم سے جھوٹ بولنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔’’ پنوں باوقار انداز میں گویا ہوا۔ ‘‘میں دراصل کیچ مکران کے حکمران شاہ امام کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں۔ سسی کے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اس سے ملنے کی آرزو میں سوداگر کا روپ دھار کے یہاں آیا۔ میرا جذبہ سچا تھا یا میرا رب مہربان کہ اس نے مجھے میری دھڑکن، میری زندگی، میری سسی سے ملا دیا۔ اب تم کسی بھی طرح سسی سے میرا بیاہ کروا دو تا کہ یہ عارضی ساتھ دائمی ہو جائے۔ کیونکہ اب ہم ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔’’

‘‘کیا واقعی...... تم کیچ مکران کے شہزادے ہو؟’’ بچائی اس کی ساری باتوں کو نظر انداز کر کے اس ایک نکتے پر اٹک گئی تھی۔ ‘‘اوہ اگر ایسا ہے تو اور بھی مشکل ہو جائے گی۔’’

‘‘بہن، بچائی۔’’ پنوں نے بے تابانہ بچائی کے ہاتھ تھام لئے۔ ‘‘تم سسی کی سب سے اچھی سہیلی ہو۔ میں نے تمہیں بہن کہا ہے اس ناتے تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔’’

‘‘اچھا۔’’ بچائی نے سوچنے والے انداز میں سر ہلایا اور کئی لمحوں تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد دھیمی آواز میں بولی۔ ‘‘ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔’’

‘‘کون سی ترکیب؟’’ پنوں بے تابانہ بولا۔ ‘‘براہ کرم جلد بتاؤ۔’’

‘‘تم سسی کے بابا سے کہہ دینا کہ تمہارا تعلق بھی دھوبی برادری سے ہے۔’’

‘‘میں یہ کہنے کو تیار ہوں۔’’ پنوں نے بے ساختہ کہا۔ ‘‘مگر کیا وہ میری بات پر یقین کر لیں گے؟’’

‘‘اس وقت سوچا جائے گا جب وہ تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ تمہاری بات پر بھروسہ کر لیں گے۔’’

‘‘تو مجھے بتاؤ، مجھے ان سے ملاقات کیلئے کب آنا ہے؟’’ پنوں نے پوچھا۔

‘‘دھیرج میرے شہزادے دھیرج۔’’ بچائی شریر انداز میں مسکرائی۔ ‘‘پہلے ہم دونوں کو میدان ہموار کر لینے دو، سسی اپنی ماں کو راضی کرے گی، میں اس کے بابا سے بات کروں گی۔ جب لوہا گرم ہوگا تو تم پہنچ جانا آخری ضرب لگانے کے لئے۔’’

سسی نے گھر آ کر منصوبے کے مطابق موقع دیکھ کر ماں سے پنوں کا ذکر کیا اور کچھ اس انداز سے اس کی تعریف کی کہ سکینہ، پنوں کو دیکھنے اور اس سے ملنے کیلئے بے تاب ہو گئی۔

ادھر بچائی نے کھیا محمد سے رابطہ قائم کیا اور ایک روز باتوں باتوں میں بولی۔ ‘‘چاچا! سسی کی شادی کب کرنے کا ارادہ ہے؟’’

‘‘کیوں؟’’ کھیا محمد نے چونک کر بچائی کی طرف دیکھا۔ ‘‘تو یہ بات کیوں پوچھ رہی ہے؟’’

‘‘ارے چاچا ویسے ہی خیال آ گیا تو پوچھ لیا...... آخر آپ کو اس کی شادی کرنی ہے تو نا...... میری ماں کی نظر میں ایک اچھا رشتہ ہے...... اگر آپ کہیں تو بات آگے بڑھائی جائے۔’’

‘‘ایک بات کان کھول کے سن لے بچائی۔’’ اس نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ‘‘میں اپنی بیٹی صرف دھوبی برادری میں ہی دوں گا۔ اگر وہ ہماری برادری کا ہے تو بے شک بات آگے بڑھاؤ...... مگر پہلے مجھے لڑکے کے بارے میں کچھ بتاؤ، کون ہے، کہاں ہے؟’’

‘‘وہ ہے نا اپنا پنوں۔’’ بچائی نے اس طرح کہا کہ جیسے وہ بھی اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ ‘‘وہی مشک و عطر و خوشبویات کا سوداگر...... کارواں سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ سسی کو سونے میں پیلی کر کے رکھے گا۔ دیکھنے میں بھی خوب کڑیل جوان ہے۔ سسی کے ساتھ جوڑی خوب سجے گی......’’

‘‘تو نے تو کہا تھا وہ دھوبی ہے؟’’ سسی کا باپ اس کی خوبیوں سے متاثر ہوئے بغیر گویا ہوا...... ‘‘اور اگر دھوبی ہے تو یہ سوداگری کیسی؟’’

‘‘ارے چاچا ذات کا تو دھوبی ہے، پہلے یہی کام کرتا تھا، پھر دوستوں کی دیکھا دیکھی مشک کا کاروبار شروع کر دیا، اوپر والے نے برکت ڈال دی تو کپڑے دھونے کا دھندا چھوڑ دیا اور پوری توجہ سوداگری پر لگائی تو دیکھتے ہی دیکھتے ہُن برسنے لگا۔’’

‘‘بچائی تو ٹھیک کہہ رہی ہے...... یا میری خوشی کی خاطر اسے دھوبی بنا کر پیش کر رہی ہے؟’’ سسی کے باپ نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

بچائی سٹپٹا کر بولی۔ ‘‘ارے چاچا، بھلا میں آپ سے جھوٹ بول سکتی ہوں...... اور وہ بھی شادی بیاہ کے معاملے میں۔ لڑکا بہت اچھا ہے، لاکھوں میں ایک، بالکل آپ کا جوائی بننے کے قابل۔’’

‘‘اچھا۔’’ وہ گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولا۔ ‘‘اگر تم اس کی اتنی تعریف کر رہی ہو...... تو چلو اس سے مل لیتے ہیں، باقی کا فیصلہ اس سے ملنے کے بعد ہوگا۔’’

بچائی خوشی سے لرزتی سسی کے پاس پہنچی اور اسے یہ خوش خبری سنائی۔

‘‘سچ کہہ رہی ہے بچائی۔’’ سسی نے بے یقین لہجے میں سوال کیا۔ ‘‘کیا واقعی بابا مان گئے؟’’

‘‘اس حد تک تو مان گئے ہیں کہ وہ پنوں سے ملنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ باقی کا فیصلہ وہ اس سے مل کر کریں گے...... اور مجھے یقین ہے کہ اس شہزادے سے ملنے کے بعد وہ انکار کا سوچ بھی نہیں سکیں گے۔’’

بچائی اسی وقت پنوں کو یہ خوش خبری سنانے روانہ ہو گئی۔ پنوں کا چہرہ یہ خبر سن کر خوشی سے دمکنے لگا۔ ‘‘مجھے ان سے ملنے کے لئے کب آنا ہے؟’’ پنوں نے سوال کیا۔ ‘‘کہو تو آج شام کو ہی آ جاؤں؟’’ پنوں کی بے تابی عروج پر تھی۔ اس نے کب سوچا تھا کہ اتنی آسانی سے اسے منزل مل جائے گی۔ تقدیر کی دیوی جب اس پر مہربان ہو گئی تھی تو وہ اب اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا لینا چاہتا تھا۔

‘‘ٹھیک ہے تم شام کو اپنے دوست اسامہ کے ساتھ آ جانا۔’’

☆......☆......☆

پنوں نے جب اسامہ کو بتایا تو وہ حیران رہ گیا۔

‘‘کیا کہہ رہے ہو پنوں؟ کیا واقعی تم سسی سے شادی کا ارادہ رکھتے ہو؟’’

‘‘ہاں اسامہ۔’’ پنوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ‘‘یہ میرے رب کی کرم نوازی ہے کہ اس نے وہ راہ کھول دی ہے کہ جس پر چل کر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی سسی کو حاصل کر لوں گا۔’’

‘‘مگر ذرا سوچو پنوں؟’’ اسامہ نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ‘‘کہاں تم کیچ مکران کے شہزادے کہاں، وہ بھنبھور کے ایک معمولی دھوبی کی بیٹی...... کیا یہ جوڑ مناسب رہے گا؟’’ کیا تمہارے والدین اس شادی کی اجازت دے دیں گے اور اگر تم ان سے اجازت لئے بغیر شادی کر لو گے تو کیا وہ سسی کو بہو کی حیثیت سے قبول کر پائیں گے؟’’

پنوں نے ان سوالوں میں سے کسی ایک کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور نہ ہی سوچنا چاہتا تھا۔ اب اس کے لئے سسی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔

‘‘یہ سب مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔’’ پنوں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ‘‘کیونکہ میں نے اب یہیں بھنبھور میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ سسی کے گھر جانے میں کوئی پریشانی محسوس کر رہے ہو تو تمہیں اختیار ہے، تم میرے ساتھ مت چلو، میں اکیلا ہی وہاں چلا جاؤں گا......’’

‘‘مگر پنوں.. ذرا سوچو.. اگر تم مستقل یہیں رہ پڑے تو تمہاری ماں، تمہارے بھائی اور وہ تمہارا بے حد و حساب چاہنے والا باپ...... وہ کس طرح جی سکے گا؟’’

‘‘میں بس اتنا جانتا ہوں کہ اب میں سسی کے بغیر جی نہیں سکتا۔ ان کے پاس ان کے تین بیٹے اور ہیں، وہ ان کے سہارے جی لیں گے، مگر میری زندگی کا یقین تو صرف اور صرف سسی ہے۔’’

اب اسامہ کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے کاہے کو پنوں کو سسی کے بارے میں بتایا...... وہ نہ اسے بتاتا، نہ وہ دیوانہ ہو کر یہاں آتا اور نہ ہی مستقل یہاں رہنے کا فیصلہ کرتا۔ اب وہ سوچ رہا تھا، ایسی صورت میں واپس وطن جا کر وہ اس کے ماں باپ کو کیا جواب دے گا۔ وہی تو اصرار کر کے اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔

‘‘ٹھیک ہے تو پھر میں چلتا ہوں۔’’ اسے سوچوں میں کھویا دیکھ کر پنوں اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

‘‘ذرا ٹھہرو۔’’ اسامہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ‘‘چلو۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔’’

وہ دونوں سسی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

سسی کا باپ، اسامہ سے تو مل چکا تھا۔ پچھلی بار اس نے اسے بطور مہمان بلوایا تھا اور خوب خاطر مدارات کی تھی۔ تب ہی اسامہ کی نظر سسی پر پڑی تھی جو آنگن میں نیم کے پیڑ تلے بیٹھی کشیدہ کاری کر رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی اسامہ کو یوں لگا تھا جیسے غروب ہوتا سورج ایک بار پھر پوری آب و تاب کے ساتھ سسی کے روپ میں اس کی نظروں کے سامنے آ گیا ہو۔

‘‘یہ کھیا کی بیٹی سسی ہے۔’’ اس کے ساتھ آئے دوسرے سوداگر نے اسے سسی کو یوں گھورتے دیکھ کر ٹہوکا دیتے ہوئے سرگوشی میں سرزنش کی۔ ‘‘ایسے کیوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو۔ اس کا باپ دیکھے گا تو کیا سوچے گا؟’’

اور اسامہ گڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا تھا، مگر اس کی نظریں ہیر پھیر کر سسی کی سمت اٹھ جاتی تھیں۔

سسی کا باپ پنوں سے ملا تو حیران ہوا۔ وہ ایک وجیہہ و شکیل نوجوان تھا۔ شاہی جاہ و وقار اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ چہرے سے ہی شائستگی اور شرافت کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ مگر اس کے دل میں کھٹک سی تھی۔ اس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ اونچا لمبا، شاندار شہزادے جیسا لڑکا دھوبی برادری کا ہے۔

‘‘چاچا! آپ نے کیا فیصلہ کیا؟’’ پنوں اور اسامہ کے جانے کے بعد بچائی نے بے تابی سے سوال کیا۔ ‘‘پنوں آپ کو پسند آیا نا...... میں نے جیسا بتایا تھا وہ بالکل ویسا ہی ہے نا؟’’

سسی کے باپ نے متفکر نظروں سے بچائی کی طرف دیکھا۔ ‘‘تو نے جیسا بتایا تھا وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ میری سسی کے لئے پنوں سے اچھا بر مل ہی نہیں سکتا۔ دونوں کی چاند سورج کی جوڑی ہے۔’’

‘‘واہ چاچا جب یہ سب سوچ لیا...... تو اب اور کیا سوچ رہے ہو، فوری طور پر فیصلہ کر لو۔’’

‘‘فیصلہ تو میں نے کر لیا ہے مگر فیصلے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے میں پنوں کو آزمانا چاہتا ہوں۔ جانے کیوں میرے دل کو یقین نہیں آ رہا کہ وہ دھوبی ہے اور میں اپنی بیٹی کسی اور سے بیاہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔’’

‘‘پھر کیا پریشانی ہے۔’’ اس نے بھویں سکیڑ کر بچائی کی سمت دیکھا۔ ‘‘اگر وہ دھوبی ہے تو اسے امتحان دینے میں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ تم نے آج صبح ہی بتایا تھا کہ پہلے وہ کپڑے دھونے کا کام کرتا تھا۔ اگر وہ یہ کام کرتا رہا ہے...... تو اب بھی کر سکتا ہے۔’’

‘‘کیا مطلب؟’’ بچائی نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

سسی کے باپ کے قریب ایک میلے کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھری رکھی ہوئی تھی، اس نے وہ گٹھری بچائی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ‘‘یہ کپڑے عبدل بنیئے کے ہیں...... پنوں کو یہ کپڑے دو اور اس سے کہو کہ وہ انہیں دھو کر لے آئے...... بس اطمینان ہو جائے گا۔’’

‘‘ارے چاچا...... بس اتنی سی بات؟’’ بچائی نے بظاہر انتہائی لاپروائی سے جواب دیا مگر دل ہی دل میں وہ سہم گئی تھی۔ جانتی تھی محلوں میں رہنے والا ناز و نعم میں پلا وہ شہزادہ بھلا گھاٹ پر کپڑے دھونا کیا جانتا ہوگا، مگر پھر بھی اس نے کپڑوں کی گٹھری اٹھائی اور پنوں کے پاس جا پہنچی۔

‘‘پنوں، سسی کے بابا کو شک ہے کہ شاید تم دھوبی نہیں ہو، اسی لئے وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ یہ چند کپڑے عبدل بنیئے کے ہیں، انہیں گھاٹ پر جا کر دھو کے لے آؤ۔ اس کے بعد بس سمجھو سسی تمہاری ہوئی۔’’

‘‘سچ۔’’ پنوں کا دلکش چہرے فرط حسرت سے دمکنے لگا۔ ‘‘یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، میں ابھی دھو کے لے آتا ہوں۔’’

وہ کپڑے اٹھا کر گھاٹ پر پہنچا اور گٹھری کھول کر کپڑے نکالے اور دھونے بیٹھا۔ اس نے آج تک ایک رومال بھی نہیں دھویا تھا، بھلا کپڑے وہ کیا دھوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہاتھ تو رگڑ اور سوڈے سے چھلے ہی، مگر کپڑے بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ یہ دیکھ کر پنوں کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ہاتھوں کا غم نہ تھا، پریشانی یہ تھی کہ وہ عبدل بنیئے کو یہ پھٹے اور مسلے ہوئے کپڑے کس منہ سے دے گا اور سسی کے باپ کو کیا منہ دکھائے گا۔ وہ عالم پریشانی میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

جب کافی دیر ہو گئی اور پنوں کپڑے لے کے بچائی کے پاس نہیں پہنچا تو بچائی خود ہی گھاٹ پر پہنچی۔ دیکھا پنوں سر جھکائے ملول و رنجور بیٹھا ہے۔ اس نے بچائی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اشکبار آنکھوں سے کہا۔ ‘‘بچائی! شاید میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ میں سسی کو پا کر بھی نہ پا سکوں۔ اس کی خاطر میں نے گھر بار و وطن چھوڑا، باپ بھائیوں سے الگ ہوا، سوداگر کا بھیس بدلا اور میلوں کا سفر طے کر کے یہاں پہنچا...... مگر شاید اسے حاصل کرنا میرے مقدر میں ہے ہی نہیں۔

‘‘پنوں اتنی جلدی ہمت ہار گئے؟’’ بچائی محبت بھرے انداز میں آگے بڑھی۔ ‘‘تم اتنی دور سے سفر کر کے یہاں تک پہنچ گئے۔ تم نے سسی کے دل کو فتح کر لیا...... اب جبکہ منزل سامنے دکھائی دے رہی ہے تو اس طرح ہمت کیوں ہار رہے ہو؟’’

‘‘پھر تم ہی کہو میں کیا کروں؟’’ پنوں نے بے بس لہجے میں سوال کیا۔

‘‘دیکھو سسی میری سہیلی ہے اور تم نے مجھے، بہن کہا ہے۔ اس لئے ہر مشکل وقت میں تم دونوں کے کام آنا میرا فرض ہے۔’’ بچائی بااعتماد انداز میں مسکرائی۔ ‘‘بس اب میں جو کہوں اس پر عمل کرو...... ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔’’

پنوں کو قدرے اطمینان ہوا، امید بھری آواز میں بولا۔ ‘‘بچائی میری، بہن تمہارا یہ احسان میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔’’

‘‘یہ سب باتیں بعد میں کرنا۔’’ بچائی جلدی سے بولی۔ ‘‘پہلے سنو اس وقت کیا کرنا ہے۔’’

پنوں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

‘‘تم یوں کرو۔’’ بچائی وہ ترکیب اس کے گوش گزار کرنے لگی جو اس نے سوچی تھی۔ پنوں نے اس کی ترکیب پر عمل کرتے ہوئے بنیئے کے پھٹے کپڑوں کی گٹھری بنائی اور اوپر کے کپڑے میں گرہ لگا کر اس میں چار اشرفیاں باندھ دیں۔ اس کے بعد وہ کپڑے لے کر سیدھا بنیئے کی دکان پر پہنچا اور لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ‘‘سیٹھ جی! میں نیا نیا کام پر لگا ہوں۔ کپڑے دھوتے ہوئے پھٹ گئے ہیں۔ آپ کے کپڑوں کی قیمت میں نے کپڑوں کے ساتھ باندھ دی ہے۔’’

‘‘کیا......؟’’ بنیئے نے حیرت سے ساری بات سنی اور جھٹ سے گرہ کھول کر چار اشرفیاں نکال لیں۔ سونے کی چھچھماتی اشرفیاں دیکھ کر اس کی حریص آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی...... مسکرا کر بولا۔ ‘‘چل ٹھیک ہے۔ میں کھیا سے شکایت نہیں کروں گا۔ کپڑے پھٹ گئے سو پھٹ گئے، تیری نوکری چلتی رہے۔’’

‘‘مہربانی سیٹھ جی۔’’ پنوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ‘‘بس ایک احسان اور کر دیجئے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ تمہیں تمہارے کپڑے، بہت اچھی طرح دھل کر مل گئے ہیں۔’’

‘‘چل ٹھیک ہے...... کہہ دوں گا۔’’ بنیا شان بے نیازی سے بولا۔ ‘‘پر سن بھائی آئندہ بھی میرے کپڑے تو ہی دھویو......’’

‘‘جی اچھا۔’’ پنوں نے جھک کر ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی واپسی کے لئے مڑ گیا۔

بچائی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بچائی کے پاس جا کر صورت حال کی اطلاع دی۔ اس کے چہرے پر بھی اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اسی وقت سسی کے باپ کے پاس پہنچی۔

‘‘چاچا! اب تو آپ کو یقین آ گیا نا کہ پنوں ذات کا دھوبی ہے۔’’ اس کے سوال پر اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ‘‘پر ابھی تک اس نے کپڑے کہاں دھوئے؟’’

‘‘لو وہ کپڑے دھو کے، سکھا کے بنیئے کو دے بھی آیا۔ بنیا تو کپڑے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بولا کھیا کے یہاں نئے آئے ہو کام کرنے...... پر کام بہت عمدہ کیا ہے...... چاچا، چاہو تو بنیئے سے معلوم کر لو۔’’

‘‘ارے اب کیا معلوم کرنا۔’’ وہ مطمئن انداز میں مسکرایا۔ ‘‘اسے میں جانتا ہوں۔ اگر کپڑے اچھے دھلے نہ ہوتے تو اب تک وہ شور مچاتا یہاں پہنچ چکا ہوتا۔’’

‘‘تو اب بولو...... آپ نے کیا سوچا ہے؟’’ بچائی نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

‘‘اب سوچنا کیا؟’’ سسی کا باپ خوش دلی سے بولا۔ ‘‘ابھی جا کر تیری چاچی سے مشورہ کرتا ہوں کہ نکاح کے لئے کون سا دن اچھا رہے گا۔’’

وہ سکینہ کی طرف گیا اور بچائی بھاگتی ہوئی سسی کے پاس پہنچی۔

‘‘سسی، میری، بہن میری سکھی، تجھے بہت بہت مبارک ہو۔’’

‘‘کیا ہوا...... کیا بابا مان گئے؟’’ سسی نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

‘‘نا صرف مان گئے بلکہ وہ اندر چاچی کے پاس مشورہ کرنے گئے ہیں کہ نکاح کے لئے کون سا دن اچھا رہے گا۔’’

‘‘سچ بچائی۔’’ سسی نے بے ساختہ بچائی کو گلے لگا لیا۔ ‘‘سچ تو یہ ہے، بچائی کہ یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہی ممکن ہوا...... ورنہ......’’ احساس تشکر سے سسی کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

‘‘پاگل ہوئی ہے کیا؟’’ بچائی نے ایک بار پھر اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ‘‘اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اصل کمال تو تیرے پنوں کا ہے جو تیری خیالی تصویر کے تصور میں اپنا شہر، اپنا وطن چھوڑ کے یہاں آ پہنچا۔ یہ کمال تیرے دل کا ہے جس نے پنوں کے بے پناہ جذبے اور بے پایاں محبت کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا اور یہ عطا اس رب کی ہے جس نے تم دونوں چاہنے والوں کے مقدر میں ملن لکھ دیا ورنہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔’’

‘‘ارے چھوکریو، کہاں ہو تم۔’’ سکینہ گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ سسی کے باپ نے آنے والے جمعے کو نکاح کی تاریخ رکھ دی تھی۔ اس خبر نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے تھے۔ وہ اس کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی تھی۔ وہ اس کی شادی میں اپنے دل کے سب ارمان نکالنا چاہتی تھی۔

‘‘بچائی...... پُت اپنے گھر جا کے ذرا اپنی ماں کو تو میرے پاس بھیج۔’’ وہ بچائی سے مخاطب ہوئی۔ ‘‘مجھے سسی کے نکاح کی تیاری کے سلسلے میں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔’’

‘‘چاچی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بولیں۔’’ بچائی سعادت مندی سے بولی۔

‘‘بس تو اپنی سسی کے ہاتھوں پیروں کو مہندی سے رنگ دے۔ ہلدی چندن اور چنبیلی کا تیل ملا کر ابٹن بنا لے اور میری سسی کے روپ کو نکھار دے۔’’

سسی لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ سجائے نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ سکینہ اس کی طرف بڑھی۔ ‘‘ماں صدقے...... ابھی سے میری لاڈلی پر روپ اتر آیا ہے، تو سدا سکھی رہے، دودھوں نہائے، پوتوں پھلے......’’ اس نے آگے بڑھ کر سسی کو کھینچ کے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سسی کا باپ بھی شادی کی تیاریوں میں لگا تھا۔ کیونکہ پنوں پردیسی تھا۔ اسی لئے اس نے اپنے شاندار مکان کا سب سے کشادہ اور خوب صورت کمرہ حجلۂ عروسی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ حجلۂ عروسی کو پھولوں اور دیگر آرائشی اشیاء سے سجایا جا رہا تھا۔

پنوں بھی شادی کی خریداری میں مصروف تھا۔ اس کے پاس اشرفیوں سے بھری کئی تھیلیاں تھیں۔ وہ سسی کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ لباس اور زیورات خریدنا چاہتا تھا مگر اس کے دوست خوش نہیں تھے۔ خاص طور پر اسامہ سخت ہراساں و پریشان تھا۔

(جاری ہے)

آخری قسط

’’پنوں! اس شادی کا آخر مقصد کیا ہے...... کیا تم سسی کی خاطر ہمیشہ کے لئے اسی شہر میں بس جانا چاہتے ہو؟‘‘

’’ہاں۔ میں نے ایسا ہی سوچا ہے۔‘‘ پنوں کے جواب نے اسے اور پریشان کر دیا۔

’’مگر ذرا سوچو...... وہاں تمہارے گھر والے، تمہاری ماں، بے حد چاہنے والا باپ، تمہاری راہ تک رہا ہے۔ کیا ایک لڑکی کی خاطر تم ان سب کو بھول جاؤ گے۔ ان سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاؤ گے۔‘‘

’’دیکھو اسامہ......‘‘ پنوں نے اسامہ کے شانے پر رسان بھرے انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ’’تم میرے دوست ہو...... سسی میری زندگی ہے اور اس سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ اگر تم خوشی سے میری خوشی میں شریک ہو سکتے ہو تو شریک ہو جاؤ ورنہ واپسی کا راستہ کھلا ہے...... تم واپس جا سکتے ہو...... مگر براہ کرم مجھے میری سسی کے خلاف بھڑکانے کی کوشش مت کرو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے وہ مجھے کس قدر عزیز ہے۔ اس کے بغیر میں سانس بھی نہیں لے سکتا۔‘‘

اُسامہ خاموش ہو گیا اور اسی رات وہ اپنے دونوں دوستوں کو ساتھ لے کر وطن کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ وہ پنوں کی شادی میں شریک ہو کر اس کے باپ کی نگاہ میں مجرم نہیں بننا چاہتا تھا۔

اسامہ کے یوں چلے جانے کا پنوں کو افسوس تو ہوا مگر اگلے ہی لمحے وہ آنے والی خوشی کے تصور میں گم ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں بچائی آنے والی تھی۔ آج وہ اس کے ساتھ بازار جانے والا تھا تاکہ سسی کیلئے سہاگ کا جوڑا، زیور اور دیگر اشیاء خرید سکے۔

ادھر سسی کی ماں سکینہ بھی شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ شہزادے جیسا داماد پا کر وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس نے اپنے سارے زیور سسی کو دینے کے لئے نکال لئے تھے۔

’’ہائے ہائے سکینہ بہن، یہ کیا کر رہی ہو؟‘‘ بچائی کی ماں صاحبی نے حیرت سے کہا۔ ’’بچائی بتا رہی تھی پنوں کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں، وہ خود سسی کے لئے آج کپڑے اور زیور خریدنے جا رہا ہے بھلا تمہیں اپنا زیور گہنا اسے دینے کی کیا ضرورت؟‘‘

دراصل صاحبی ایک گھریلو سیدھی سادی عورت تھی۔ وہ بالکل پڑھی لکھی نہ تھی، اسلئے اس میں جاہل عورتوں والی فطری خامیاں بہ درجہ اتم موجود تھیں۔ گو کہ سکینہ سے اس کی دوستی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی سسی، بچائی کی سب سے اچھی سہیلی ہے۔ کھیا ہونے کے ناتے وہ سسی کے باپ کی بھی بے حد عزت کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ دل ہی دل میں سسی اور سکینہ سے جلتی تھی۔ فطرتاً وہ ایک حاسد عورت تھی۔ پنوں کو دیکھ کر اس کا دل جل کر کباب ہو گیا تھا اور یہ بات اس کیلئے اور بھی اذیت ناک تھی کہ شہزادے جیسے پنوں سے سسی کا رشتہ کروانے میں بچائی نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

’’تو بھی رہی نری کی نری چری۔‘‘ گھر پہنچتے ہی اس نے بچائی کو آڑے ہاتھ لیتے ہوئے کہا۔ ’’پنوں جیسے مالدار لڑکے سے سسی کا رشتہ کروانے کی کیا ضرورت تھی؟ تجھے اپنی دو جوان بہنیں دکھائی نہیں دیں جو سل کی طرح میرے سینے پہ دھری ہیں۔‘‘

’’ماں! کیسی بات کر رہی ہو۔‘‘ بچائی نے حیرانی اور قدرے ناگواری سے ماں کو دیکھا، گو کہ وہ ماں کی عادت اور فطرت سے واقف تھی، اس کے باوجود اسے ماں کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ ’’پنوں کی شادی میں اپنی بہنوں میں سے کسی سے کروا دیتی؟‘‘

’’اور نہیں تو کیا؟‘‘ صاحبی چیخ کر بولی۔ ’’سسی کھیا کی بیٹی ہے۔ حسین ہے۔ بھلا اس کے لئے رشتوں کی کیا کمی ہے۔ کمی اور پریشانی تو ہم جیسے لوگوں کے لئے ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر پنوں کی شادی اپنی دلاری سے ہو جاتی۔‘‘

’’ماں۔‘‘ بچائی ضبط بھرے لہجے میں بولی۔ ’’پنوں کی شادی پوری دنیا میں سسی کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہیں۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ صاحبی نے غصے بھرے انداز میں ہنکارا بھرا۔ ’’چار لفظ کیا پڑھ لئے ان بالشت بھر کی چھوکریوں کے دماغ ہی خراب ہو گئے۔‘‘

اسے اٹھتے ہوئے دیکھ کر بچائی نے جلدی سے پوچھا۔ ’’ماں! کہاں چل دیں؟‘‘

’’سکینہ کے پاس جا رہی ہوں۔‘‘ صاحبی نے رکھائی سے جواب دیا۔

’’ماں! ایک بات سنتی جاؤ۔‘‘ بچائی پکار کر بولی۔ ’’وہاں ایسی ویسی بات نہ کرنا کہ جس سے بلاوجہ دل میلے ہوں۔‘‘

صاحبی نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے چلتی ہو سسی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سکینہ اس وقت سسی کے جہیز میں دینے کے لئے اپنے زیور نکال رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرا کر بولی۔ ’’آؤ آؤ صاحبی بہن۔ دیکھو تو...... یہ زیور ٹھیک ہیں نا۔ انہیں اجلوانے کی تو ضرورت نہیں؟‘‘

’’یہ کیا ہے؟ صاحبی نے حیرت سے سونے کے چمکتے اور چاندی کے دمکتے زیورات کی طرف دیکھا۔ ’’تمہیں یہ سب سسی کو دینے کی کیا ضرورت ہے؟ پنوں تو خود زیورات گہنے اور کپڑے لتے خریدے گا۔‘‘

’’وہ تو خریدے گا۔‘‘ سکینہ اس کے لہجے کی کھوٹ کو محسوس کیے بغیر مسکرا کر بولی۔ ’’تم تو جانتی ہو...... سسی ہی ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ بھلا اس کے سوا یہ سب ہم کس کے لئے بچا کر رکھیں گے۔ اول و آخر یہ سب اسی کا تو ہے۔‘‘

’’خود کو کنگال کرنے سے پہلے، بہن سکینہ یہ نہ بھولنا کہ سسی تمہاری اپنی بیٹی نہیں ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ وہ ایک صندوق میں بہتی ہوئی اجلا گھاٹ پر آ لگی تھی اور میرا گھر والا وہ صندوق اٹھا کر کھیا جی کے پاس لایا تھا۔‘‘

’’صاحبی۔‘‘ سکینہ نے حیرت اور غصے سے صاحبی کی طرف دیکھا۔ ’’تیری زبان پہ چھالے کیوں نہیں پڑ گئے، یہ بات نکالتے ہوئے کہ سسی میری بیٹی نہیں ہے۔ خبردار جو پھر کبھی ایسی بات منہ سے نکالی۔ میں نے بے شک اسے جنم نہیں دیا مگر خون جگر پلا کر میں نے اسے پالا ہے۔ گود میں کھلایا ہے۔ اس کے لاڈ اٹھائے ہیں۔ میں تو کب کی یہ بات بھول چکی کہ میں نے اسے جنم نہیں دیا۔‘‘ یہ کہتے سکینہ کی پلکیں نم ہو چلی تھیں۔

’’سکینہ بہن...... ذرا سنو تو......‘‘ صاحبی کو گو کہ اس کا لب و لہجہ برا لگا تھا پھر بھی رسان بھرے لہجے میں بولی۔ ’’میرا یہ مطلب نہیں تھا۔‘‘

’’تمہارا جو بھی مطلب تھا مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ بہتر ہو گا تم اس وقت یہاں سے چلی جاؤ۔‘‘

’’اس وقت کیا؟‘‘ صاحبی بل کھا کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ ’’تم کہو تو میں شادی میں بھی شریک نہ ہوں۔ مجھے کیا لینا دینا کسی سے۔‘‘ وہ پاؤں پٹختی اپنے گھر کی طرف چل دی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے کپڑوں کی ایک گٹھری اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

’’ارے ماں...... یہ کپڑے لے کے تم کہاں جا رہی ہو؟‘‘ بچائی نے دیکھا تو حیرت سے بولی۔ ’’اب شام ہونے میں دیر ہی کتنی ہے اور تم جانتی ہونا کہ شام کو سسی کا بیاہ ہے۔‘‘

’’سسی کا بیاہ ہو یا پنوں کا نکاح...... مجھے کیا؟‘‘ صاحبی نے دل جلے انداز میں سوچا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

’’ارے ماں...... تم کیا سسی کی شادی میں شریک نہیں ہو گی۔ ذرا سوچو وہ میری سب سے اچھی سہیلی ہے۔ پھر وہ کھیا چاچا کی بیٹی ہے۔ یہ کس کے کپڑے ہیں، انہیں تو کل بھی دیا جا سکتا ہے۔‘‘

’’یہ ہندو بستی کے پنڈت کی پتنی، دیوی پجارن کے کپڑے ہیں۔‘‘ صاحبی نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ ’’اور مجھے اسی وقت پہنچانے ہیں۔ آج شام کو ان کے یہاں پوجا ہے۔‘‘

’’میری آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘ بچائی قدرے بیزاری سے بولی۔ ’’یہ ہندو ہم مسلمانوں سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ ان کے پن گھٹ کے پاس سے کوئی مسلمان گزر جائے تو ان کی عورتیں پانی سے بھرے مٹی کے گھڑے چھوڑ دیتی ہیں کہ نجس ہو گئے۔ بھلا وہ پجارن کیسی ہے، جو ایک مسلمان دھوبن سے اپنے کپڑے دھلواتی ہے؟‘‘

’’مجھے اس سے کیا؟‘‘ صاحبی نے بے نیازی کے اظہار کیلئے کاندھے اچکائے۔ ’’میں بس اتنا جانتی ہوں۔ مجھ سے کپڑے دھلوانے کے وہ پجارن دُگنے پیسے دیتی ہے اور مجھ سے پیار اور عزت سے بات کرتی ہے۔‘‘

بچائی نے بے بس نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھی وہ ایک ضدی اور خودسر عورت ہے، مانے گی نہیں۔ اسی لئے دھیرج بھرے لہجے میں بولی۔ ’’اچھا چلو۔ اگر یہ کپڑے آج ہی پہنچانے اس قدر ضروری ہیں تو ذرا جلدی لوٹ آنا...... تاکہ پنوں کی بارات اور سسی کی طرف سے شادی میں شریک ہو سکو۔ ماں، پنوں یہاں پردیسی ہے۔ اس کا یہاں اپنا کوئی نہیں ہے۔ اس نے مجھے بہن کہا ہے۔ اس ناتے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی خوشی میں اس کے ساتھ شریک ہوں۔‘‘

’’میں نے تجھے کب روکا۔ وہ تیرا بھائی ہے تو جا۔ اس کی خوشی میں شریک ہو۔ میں جلدی لوٹ آئی تو میں بھی شریک ہو جاؤں گی۔‘‘ یہ کہہ کر صاحبی گھر سے نکل گئی۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔ بچائی کو پنوں کے ساتھ صراف بازار جانا تھا، اس لئے اس نے مزید فضول باتوں میں دماغ کھپانے کی بجائے پنوں کی طرف جانے کا فیصلہ کیا اور دوپٹہ اچھی طرح پھیلا کر اوڑھتی ہوئی قافلہ سرائے کی طرف چل دی۔

پنوں نے بچائی کی مدد سے بھنبھور کے سب سے قیمتی کپڑے اور سب سے اچھے اور بیش قیمت زیور خریدے۔

’’انہیں پہن کر سسی تو چودھویں کا چاند لگے گی۔‘‘ بچائی نے مسرور لہجے میں سوچا تھا اور کپڑے اور گہنے لے کے سسی کے گھر کی طرف چل دی۔ ابھی اسے سسی کو دلہن بھی بنانا تھا۔

o......o......o

سہ پہر پوری طرح ڈھلی نہیں تھی۔ اگرچہ دھوپ کی تپش اور تمازت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ہواؤں میں ایک حرارت کا احساس برقرار تھا۔ صاحبی کپڑوں کی گٹھری سر پر رکھے تیزی سے دریا کی طرف چلی جا رہی تھی۔ جوں جوں وہ دریا کے قریب ہو رہی تھی، ہواؤں میں تسکین اور ٹھنڈک کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

اجلا گھاٹ کے نیم پتھریلے کنارے سے دریا کی چھوٹی چھوٹی سبک رو لہریں نزاکت بھرے انداز سے ٹکراتی اور آہستگی سے واپس پلٹ کر دریا کے تلاطم میں گم ہو جاتیں۔ صاحبی دریا کے ساتھ ساتھ چلتی ذرا آگے جا کر دریا پر لکڑی کے پٹوں اور کھجور کے تنے سے بنے پل سے گزر کر دوسری جانب جا پہنچی تھی۔ سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ کافی آگے جا کر کھیت تھے۔ کچھ کھجور کے درخت بھی جھنڈ کی صورت موجود تھے۔

اس سے آگے ہندوؤں کی ایک بڑی بستی تھی۔ بستی کے بالکل آخری سرے پر ایک اونچے نوکیلے کلسوں والا مندر تھا۔ مندر کے کلسوں پر پیتل منڈھا ہوا تھا، جو اس پل ڈوبتے سورج کی کمزور سی کرنوں میں سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ صاحبی تیزی سے قدم بڑھاتی مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت مندر کی سنگی سیڑھیوں پر بڑا پنڈت اور پجاری سورداس اپنے چند بھگتوں اور چیلوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ اندھا تھا...... مگر آہٹ سے سب کو پہچان لیتا تھا۔ وہ بڑے گیان دھیان والا پنڈت تھا۔ ہندوؤں میں اس کی بڑی عزت تھی۔

صاحبی مندر کا چکر کاٹ کر پچھلی جانب بنے اس کے عالیشان پختہ گھر کی طرف مڑ گئی تھی۔ سامنے چند سنگی قدمچوں کے اوپر چوکور پختہ آنگن تھا۔ آنگن کے تین اطراف ہاتھ بھر اونچی دیوار تھی۔ دیوار پہ خوب گل بوٹے بنے تھے اور بیچ بیچ مٹی کے گول پیالے میں پودے لگے تھے۔ صحن کے بالکل درمیان میں ایک چوکور سے تھلے میں تلسی کا پودا لگا تھا۔ اس کے صحن میں داخل ہوتے ہی سامنے کا دروازہ کھول کر ادھیڑ عمر کی حسین و باوقار پجارن دیوی باہر نکلی تھی۔

’’ارے صاحبی...... تم...... اس سمے؟‘‘ اس کی میٹھی آواز سے حیرت جھلک رہی تھی۔

’’بس دیوی جی! میں نے سوچا شام کو آپ کے گھر پوجا ہے...... تو شاید آپ کو کپڑوں کی ضرورت پڑے...... اسی لئے بے وقت چلی آئی۔‘‘

’’بے وقت تو کیا۔‘‘ دیوی دھیمے لہجے میں بولی۔ ’’بس یہ چنتا ہے کہ واپس اپنی بستی پہنچتے پہنچتے تمہیں رات پڑ جائے گی۔‘‘

’’ہاں اب مجھے بھی پچھتاوا ہو رہا ہے۔‘‘ صاحبی سیڑھیوں پر گٹھری رکھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اتنا لمبا سفر کر کے آنے کے باعث وہ خاصی تھک گئی تھی۔ ’’آج ہمارے کھیا کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ اس میں جانا بھی ضروری ہے۔‘‘

’’اچھا۔‘‘ دیوی کی آنکھیں بے ساختہ چمک اٹھیں۔ ’’بھلا اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے؟‘‘

’’اپنی ہی برادری کا چھورا ہے۔‘‘ صاحبی قدرے بیزاری سے بولی۔ ’’پردیسی ہے اس لئے اس کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔ دیکھا جائے تو چھوکری کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں بھی کسی کو کچھ پتہ نہیں کون ہے، کہاں سے آئی...... اس کے ماں باپ کون تھے؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ اس کی بڑبڑاہٹ دیوی تک پہنچ گئی تھی۔ ’’ابھی تو تم نے بتایا کہ کھیا کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ اب کہہ رہی ہو کہ وہ کون ہے...... کیا ہے؟‘‘

’’ہاں بی بی جی۔‘‘ صاحبی رازداری سے بولی۔ ’’سچ یہی ہے کہ سسی کھیا کی بیٹی نہیں ہے۔‘‘

’’سسی۔‘‘ بے ساختہ چونک کر دیوی نے یہ نام دہرایا تھا۔ کیسا میٹھا لیکن سندر نام تھا کہ لبوں پہ آتے ہی دل میں اتر گیا تھا۔

’’ہاں۔‘‘ صاحبی اس کے محسوسات کو محسوس کیے بنا اپنی ہی روانی میں بولے چلی گئی۔ ’’برسوں پہلے کی بات ہے۔ ایک صندوق بہتا ہوا اجلا گھاٹ سے آ لگا تھا۔ اس وقت گھاٹ پر میرا گھر والا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کپڑے دھو رہا تھا۔ وہ صندوق لے کر کھیا کے پاس پہنچا۔ اس میں سے ایک بچی نکلی، جسے کھیا اور اس کی بیوی سکینہ نے پال لیا کیونکہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔‘‘

’’اوہ!‘‘ دیوی نے بے تابانہ اپنے ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا۔

اسے آج بھی برسوں پرانی وہ ابھاگن شام یاد تھی۔ ڈوبتے سورج کی لالی، خون کی صورت آسمان کے نیلے دامن پہ بکھری ہوئی تھی۔ ہواؤں کے خاموش جھونکوں میں ان سنی سسکیاں رچی ہوئی تھیں اور ایسے میں وہ اپنے پتی سورداس کے ساتھ لکڑی کا وہ صندوق لیے دریا کے کنارے موجود تھی جس میں اس کے دل کا ٹکڑا، اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک، اس کی پہلوٹھی کی بیٹی لیٹی تھی۔ پنڈتوں کی بنائی گئی کنڈلی کے مطابق اس کے نصیب میں کوئی مسلمان پتی تھا اور یہ بات کٹر ہندوؤں کے لئے انتہائی غم و غصے کا باعث بن گئی تھی۔ لوگ اپنی جان دینے اور اس معصوم نومولود کی جان لینے پر تل گئے تھے۔ مگر فیصلہ اس معصوم کے خلاف ہوا تھا اور اس کی زندگی چھین لینے کا تہیہ کیا گیا تھا مگر مسلمان بادشاہ تک خبر پہنچ جانے کے ڈر سے ننھی بچی کو ایک صندوق میں رکھ کر دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ آگے اس کے بھاگ کہ وہ جیئے یا مرے۔ مگر وہ ہندو گھرانے، ہندو بستی سے تو نکال دی گئی تھی۔

صندوق دریا کی مہربان لہروں کے حوالے کر کے وہ دونوں واپسی کیلئے پلٹ گئے تھے۔ اس کا پتی اندھا تھا اور بے حد سنگ دل کٹھور۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ مگر وہ پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل پگھل کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ رخساروں سے آنسو پھسل کر اس کے دامن میں جذب ہو رہے تھے اور وہ اس کی حفاظت اور لمبی عمر کی پراتھنا کر رہی تھی۔ ’’ہے بھگوان، اسے کسی محفوظ ہاتھوں اور محبت کرنے والے گھرانے میں پہنچا دے...... اس کی رکھشا کرنا بھگوان۔‘‘ اس وقت اسے پتہ نہیں تھا۔ مگر آج پتہ چلا تھا کہ اس کی پراتھنا قبول ہو گئی تھی۔ اس کی بیٹی کھیا محمد کے گھر اس کی بے اولاد و بانجھ پتنی سکینہ کی گود تک جا پہنچی تھی جنہوں نے اسے بیٹی بنا کر بے حد لاڈ پیار سے پالا تھا اور آج اس کا بیاہ ایک پنوں نامی سوداگر سے ہونے جا رہا تھا۔ احساس تشکر سے دیوی کی پلکیں نم ہو گئیں۔ اس نے ساڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے صاحبی کی طرف دیکھا۔

’’صاحبی! میرا ایک کام کرو گی؟‘‘

’’حکم کیجئے دیوی جی؟‘‘ صاحبی مستعدی سے بولی۔ ’’کہئے کیا کام ہے؟‘‘ دیوی اٹھ کر اندر چلی گئی اور جب واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سے پوٹلی تھی۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘ اس نے وہ پوٹلی صاحبی کی طرف بڑھائی تو اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

’’اس میں سونے کے کنگن ہیں۔ یہ میں نے اپنی بیٹی کے بیاہ کے لئے رکھے تھے۔ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے...... تو اس بن ماں باپ کی بچی کے بیاہ میں دے کر میں اپنے دل کو خوشی دینا چاہتی ہوں۔ تم یہ کنگن لے جاؤ اور سسی کو میری طرف سے دے دینا۔ میری خاطر اتنا کام کرو گی نا؟‘‘

’’جج...... جی......‘‘ صاحبی گڑبڑا کر بولی۔ اس کم بخت سسی کے نصیب واقعی کچھ زیادہ ہی اچھے ہیں۔ لو بھلا بتاؤ نہ جان نہ پہچان، نہ ذات نہ مذہب۔ یہ اجنبی پجارن بھی اس کے لئے تحفہ بھجوا رہی ہے اور وہ بھی سونے کے قیمتی کنگن۔

صاحبی نے کنگن لئے اور اسے سر کے خفیف اشارے سے سلام کرتی واپسی کے لئے پلٹ گئی۔

o......o......o

اِدھر بچائی، پنوں کے ساتھ سسی کا سہاگ کا جوڑا اور زیور خریدنے میں مصروف تھی۔ سرخ زرتار جوڑوں اور چم چم کرتے خالص سونے کے زیورات لیے وہ سسی کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی تھی۔ دور سے ہی اس کا گھر رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا دکھائی دے رہا تھا۔

رات کو چراغاں کا بھی انتظام تھا۔ کمہار چھوٹے چھوٹے دیوں میں اصلی گھی بھر کے مکان کی منڈیروں اور دیواروں پر رکھ رہا تھا۔ سسی کا باپ فطرتاً مہمان نواز تھا۔ وہ لوگوں کو بلا کر کھلانے کے بہانے تلاش کیا کرتا تھا۔ آج تو اللہ نے اسے موقع دیا تھا، اسی لئے اس نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ویسے بھی سسی اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یہ خوشی اس کے گھر کی پہلی اور آخری خوشی تھی، اسی لئے وہ اس خوشی کو خوب دھوم دھام سے منانا چاہتا تھا اور اپنی خوشی میں پوری بستی کو شریک کر لینے کا خواہش مند تھا۔ اسی ناتے آج رات کے کھانے پر دھوبیوں کی پوری برادری اس کے گھر مدعو تھی۔

اور ابھی سے کھانے کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ سامنے تندور میں نان بائی گرما گرم نان لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پلا پکانے کا ماہر، میٹھے پانی کی لذیذ پلا مچھلی میں نمک لگا کر سیخوں پر چڑھا رہا تھا تاکہ الاؤ اور دہکتے انگاروں پر سینک کر مہمانوں کے کام و دہن کا سامان کر سکے۔ دائیں جانب حلوائی جلیبی اور امرتی تلنے میں مصروف تھے۔ ساتھ ہی موتی چور کے لڈو بنائے جا رہے تھے۔ ایک بڑے کڑھاؤ میں سوجی کا لذیذ حلوہ کسا جا رہا تھا۔ مٹھائیوں کی خوشبو فضا میں شیرینی گھول رہی تھی۔

بچائی سامان کا ٹوکرہ اٹھائے تمام انتظامات کو دلچسپی اور تحسین بھری نظروں سے دیکھتی گھر میں داخل ہو گئی تھی۔ سسی کو اس کے اپنے کمرے میں مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ سامنے والے دالان میں بستی کی کئی نوجوان لڑکیاں اور بوڑھی عورتیں بیٹھی ڈھولک کی تھاپ پر شادی بیاہ کے گیت الاپ رہی تھیں۔ سسی کے کمرے میں کئی لڑکیاں ہلدی چندن اور چنبیلی کے تیل سے تیار شدہ خوشبودار ابٹن اسے مل رہی تھیں۔ تب ہی اس کی ماں سکینہ ایک بڑے پیالے میں دودھ میں بھیگی جلیبیاں لے کر اندر داخل ہوئی تب اس کی نگاہ بچائی پر پڑی تھی۔

’’ارے بیٹی بچائی تو کب آئی؟ لے تو یہ دودھ جلیبی اپنی سکھی کو کھلا تاکہ میٹھا کھا کر یہ خوب میٹھا بولے اور اس پر دلہن کا روپ ٹوٹ کر برسے۔‘‘

’’جی ابھی کھلاتی ہوں۔‘‘ بچائی ٹوکرا زمین پر رکھ چکی تھی۔ ’’چاچی، پہلے آپ یہ زیورات اور کپڑے دیکھ لو۔ یہ سہاگ کا جوڑا اور بری کے زیورات پنوں نے بھجوائے ہیں۔‘‘

’’ارے دکھاؤ تو!‘‘ تمام لڑکیاں سمٹ کر بچائی کے گرد جمع ہو گئیں اور جب بچائی نے جوڑا اور زیورات نکالے تو سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

’’بچی...... سسی بہت نصیبوں والی ہے۔ پنوں جیسا دولہا اور کیسے اعلیٰ زیورات اور کپڑے ہر لڑکی کو کہاں نصیب ہوتے ہیں۔‘‘

سسی کے لبوں پر مسرت سے لبریز شرمیلی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اسے بھی جوڑا اور گہنے بہت پسند آئے تھے۔ سکینہ بھی سب کچھ دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔

’’تو بچائی، بیٹا تو ایسا کر کہ اب اپنی سکھی کو نہلا کر دلہن بنا دے۔ شام تو ہو ہی چکی ہے۔ کچھ ہی دیر میں بارات آ جائے گی۔‘‘

’’جی اچھا۔‘‘ بچائی نے سعادت مندی سے جواب دیا اور کپڑے زیورات پلنگ پر رکھنے لگی۔

دوسری طرف پنوں دولہا کا لباس پہن کر تیار ہو چکا تھا۔ سنہری صافے اور کمخوابی شیروانی میں اس کا روپ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ گھیر دار سفید شلوار اور سنہری کھسے پہنے وہ شہزادہ دکھائی دے رہا تھا۔ گاؤں کے چند بزرگوں اور قافلہ سرائے میں مقیم چند افراد کے ساتھ وہ بارات لے کر سسی کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

آگے آگے ڈھول تاشے والے ڈھول بجاتے چل رہے تھے، جگہ جگہ رک کر دولہا اور بارات پر سے ریزگاری لٹائی جاتی تو ادھر ادھر گھومتے بچے ریزگاری پر ٹوٹ پڑتے۔

سسی کے باپ نے اپنے قریبی رشتے داروں اور دوستوں کے ساتھ دولہا کا استقبال کیا اور نکاح کے بعد مہمانوں کی شاندار خوش ذائقہ کھانوں سے مدارات کی گئی۔ ضیافت کے بعد لوگ تعریف کرتے سسی کے باپ کی دریا دلی کے گن گاتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

بچائی اور دیگر سکھیوں نے سسی کو حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا اور کھلکھلاتی اسے چھیڑتی، شوخیاں کرتی واپس لوٹ گئی تھیں۔

اب کمرے میں سسی بالکل اکیلی تھی۔ تب ہی دروازے پر ہلکی سے دستک کے ساتھ ہی اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا اور اس نے مہندی سے سجے گورے گداز ہاتھوں سے سرخ زرتار آنچل کھینچ کے گھونگھٹ کاڑھ لیا تھا۔

تب ہی پنوں دروازہ دھکیلتا اندر داخل ہوا۔ اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر آہستگی سے چلتا وہ اس کے قریب آ ٹھہرا۔ سرخ گھونگھٹ کی اوٹ سے اس کا گلابی شاداب مکھڑا جھلک رہا تھا۔ اس کی صندلی پیشانی پہ طلائی ٹیکا، ناک میں نتھ کانوں میں جھمکے اور گلے میں گلوبند دمک رہے تھے۔ ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیوں کے ساتھ سونے کے کڑے اور دیوی کے بھیجے گئے کنگن بھی کھنک رہے تھے۔

آکاش پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا اور اس مدھم سے اجالے والے خوابناک سی خوابگاہ میں بھنبھور کا چاند، سسی دمک رہی تھی۔ دلہن بن کر اس کا حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔

ابٹن، مہندی، کاجل اور پھولوں کے گجروں نے اس کے حسن میں چار نہیں ہزار چاند لگا دیئے تھے۔ پنوں نے آگے بڑھ کر اس کا گھونگھٹ اٹھا دیا تو سسی نے بے ساختہ اپنے حنا آلود ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ پنوں نے اپنے سلگتے ہاتھوں سے اس کی کلائیاں تھام کر اس کے ہاتھ چہرے سے جدا کیے۔ کانچ کی نازک چوڑیوں کی کھنک سے فضا میں جل ترنگ سا بج اٹھا تھا۔ سسی نے دراز پلکوں کی چلمن سے ہیرے کی سی دمکتی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

’’سسی، میری جان...... آنکھیں تو کھولو اور ذرا اپنے اس دیوانے کو دیکھو جس پر تقدیر کس طرح مہربان ہوئی کہ اس نے وہ چاند پا لیا جو اس کی سوچوں کے آکاش پر ضوفشانی کیا کرتا تھا۔ آج وہ چاند...... وہ سسی، اس کے اختیار میں ہے۔ سچ میں آج بے حد خوش ہوں۔‘‘

’’میں بھی!‘‘ سسی کی شرمیلی سی آواز گونجی۔ ’’میں نے کب سوچا تھا پنوں کہ میں اتنی آسانی سے تمہیں پا لوں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تمہاری ہو جاؤں گی۔‘‘

’’ہاں سسی تقدیر نے ہمیں یکجا کر دیا ہے۔ اب جیون بھر ہم ساتھ رہیں گے۔ زندگی تو کیا، اب موت بھی ہمیں جدا نہیں کر سکے گی۔ ہم ساتھ جئیں گے اور ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہوں گے۔‘‘

رات دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ منڈیروں اور دیواروں پر جلتے ٹمٹماتے دیئے یکے بعد دیگرے بجھتے جا رہے تھے۔ نیلے آسمان کے شامیانے میں ٹکے نقرئی تارے آنکھیں میچ کے زمین پر دو ستاروں کے ملن کا منظر دیکھ رہے تھے۔

چاند دودھیا چاندنی بکھیرتا، منزل کی اور محوِ سفر تھا۔ سسی اور پنوں گزرتے لمحوں کی بے آواز آہٹوں سے بے نیاز و بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ کائنات کی ہر شے اس لازوال ملن پر خنداں زن تھی۔ ہوائیں متبسم تھیں تو فضائیں گنگنا رہی تھیں۔ بستی کے سب ہی لوگ اس شادی کی کامیابی اور دولہا دلہن کی لمبی عمر اور خوشیوں کے لئے دعا گو تھے۔ اگلی شام کو پنوں نے دستور کے مطابق ایک دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا تھا، جس میں دھوبیوں کی بستی کے سب ہی لوگ مدعو تھے۔

o......o......o

کیچ مکران میں ساحل کے قریب شاہ امام کا اونچا شاندار محل اس وقت چاندنی میں سوگوار سا کھڑا تھا۔ پنوں کو وطن سے رخصت ہوئے، کئی ماہ بیت چکے تھے۔ اس کے بھائی، ماں اور اس کا باپ شاہ امام سب ہی بے حد اداس اور فکرمند تھے۔ شاہ امام بیٹے کی جدائی اور فراق میں بیمار پڑ گیا تھا۔

’’خود کو سنبھالئے۔‘‘ اس کی ماں شوہر کو سمجھاتی۔ ’’آج نہیں تو کل پنوں ضرور لوٹ آئے گا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گیا ہے۔ سفر میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔‘‘

تب ہی اطلاع ملی تھی کہ پنوں کے دوست واپس لوٹ آئے ہیں۔

’’مگر پنوں کہاں ہے؟‘‘ شاہ امام نے حیران اور وحشت زدہ لہجے میں سوال کیا تھا۔ سامنے اُسامہ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔

’’جواب کیوں نہیں دیتے۔‘‘ شاہ امام نے خائف لہجے میں دوبارہ سوال کیا۔ ’’سب خیر تو ہے نا...... میرا پنوں میرا شہزادہ خیریت سے تو ہے نا۔‘‘

’’جی بادشاہ سلامت۔‘‘ اسامہ نے جھکتے ہوئے مودبانہ جواب دیا۔ ’’وہ بالکل ٹھیک اور خوش باش ہے۔ مگر اس نے یہاں آنے سے انکار کر دیا ہے۔‘‘

’’مگر کیوں؟‘‘ شاہ امام نے حیران و پریشان لہجے میں سوال کیا۔ اس کی بیوی اور بیٹے بھی حیرت زدہ سے سامنے کھڑے اسامہ کے جواب کے منتظر تھے۔

’’کیونکہ......‘‘ اسامہ کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ ’’کیونکہ...... اس نے...... وہاں...... ایک لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔‘‘

’’شادی؟‘‘ شاہ امام کی کشادہ پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ ’’بھلا کس لڑکی سے۔ کون ہے وہ لڑکی...... کس خاندان سے ہے؟‘‘

’’وہ دھوبیوں کے کھیا کی بیٹی ہے۔‘‘ اسامہ نے بتایا۔

اسامہ کے جواب نے شاہ امام کے ساتھ اس کے تینوں جواں سال بیٹوں کے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا تھا۔ ’’ایک دھوبن سے...... ہمارے شہزادے پنوں کی شادی؟ یہ ناممکن ہے...... ہم ایسا ہرگز بھی نہیں ہونے دیں گے۔‘‘

’’مگر شاید...... اب تک تو یہ ہو چکا ہو گا۔‘‘ اسامہ نے دبے لہجے اور دھیمی آواز میں جواب دیا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ پنوں کے باپ نے سوال کیا۔ ’’تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اس نے اب تک شادی کر لی ہو گی؟‘‘

اسامہ کے اثبات میں جواب دیتے ہی بوڑھا شاہ کیچ مکران لڑکھڑا سا گیا۔ اگر اس کے بڑے بیٹے ریمز نے آگے بڑھ کر اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو شاید وہ گر گیا ہوتا۔

’’بابا! آپ ٹھیک تو ہیں؟‘‘ اس کے منجھلے بیٹے چڑے نے آگے بڑھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ چھوٹا بیٹا ہوتی بھی گھبرا گیا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ ان کا باپ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے پنوں سے کس قدر پیار کرتا ہے اور اس خیال نے کہ پنوں بھنبھور کی کسی لڑکی سے شادی کر کے مستقل وہیں رہ نہ جائے، اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ پنوں کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

’’بابا! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم آج ہی ایک قاصد روانہ کریں گے، جو پنوں کو نہ صرف آپ کا پیغام دے گا بلکہ اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آئے گا۔‘‘

قاصد روانہ کر دیا گیا۔ شبانہ روز تیز رفتار اونٹ پر سفر کرتا آخر کار چھ روز بعد قاصد پنوں کے پاس جا پہنچا۔

’’آپ سے ملنے اور آپ کے والد کا پیغام دینے کے لئے ایک قاصد آیا ہے۔‘‘ ایک خادمہ نے اندر آ کر پنوں کو اطلاع دی۔ قاصد کا نام سنتے ہی سسی کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ پنوں کے باہر نکلتے ہی سسی بھی دروازے کی اوٹ میں جا کھڑی ہوئی۔

’’شہزادے! آپ اور اس چھوٹے سے گھر میں اور اس دھوبی بستی میں۔‘‘ قاصد نے پنوں کی ٹاٹ کا پردہ سرکا کر باہر نکلتے دیکھا تو حیرت سے سوال کیا۔

’’تمہیں یہ سب جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ پنوں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ’’کام کی بات کرو۔ کس لئے آئے ہو؟‘‘

’’آپکے والد، آپ کے فراق میں سخت اداس اور پریشان ہیں۔ انہوں نے آپ کو پیغام بھجوایا ہے کہ آپ فوری طور پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ روانہ ہو جائیں۔ آپ کو دیکھنے کے لئے ان کی آنکھیں ترس گئی ہیں۔‘‘

لمحہ بھر کو پنوں کی آنکھوں میں باپ کا مشفق چہرہ گھوما۔ اس سے قبل وہ کچھ کہتا۔ دروازے کے اس طرف سے سسی کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ ’’پنوں...... خدا کے لئے...... مجھے چھوڑ کر ہرگز نہ جانا۔ ورنہ تمہاری یہ دیوانی بن موت مر جائے گی۔‘‘

پنوں کی سماعت سے جونہی سسی کی کرب انگیز آواز ٹکرائی، اس نے اجنبی نظروں سے قاصد کی طرف دیکھ کر سرد لہجے میں کہا۔ ’’والد صاحب کو میرا پیغام دے دو کہ پنوں اب خود اپنا بھی نہیں رہا۔ وہ سر تا پا سسی کا ہو گیا ہے۔ اس کے بغیر وہ نہ جی سکتا ہے اور نہ مر سکتا ہے۔ والد کے پاس پنوں کے علاوہ بھی بیٹے ہیں، انہیں اب بس ان کے ساتھ ہی خوش رہنا چاہئے...... انہیں کہنا...... پنوں کو بھول جائیں۔ اب پنوں کبھی واپس نہیں آئے گا۔‘‘

پنوں کے جواب نے جہاں سسی کے دل کو سکون دیا وہیں اس کے باپ شاہ امام کو مزید بے چین کر دیا تھا۔ وہ بیمار ہو کر پلنگ پر گر گیا۔ اس کے بیٹے باپ کی حالت دیکھ کر الجھتے، غصہ ہوتے اور پنوں کی بے حسی پر ماتم کرتے، آخر ان تینوں نے فیصلہ کیا کہ باپ کی خوشی اور زندگی کی خاطر انہیں کچھ کرنا ہو گا چنانچہ ایک شام وہ تینوں تیز رفتار سفید اونٹوں پر بیٹھ کر بھنبھور کی جانب روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اُسامہ سے اچھی طرح نا صرف بھنبھور کا بلکہ سسی کے گھر کا پتہ بھی سمجھ لیا تھا۔

o......o......o

نیلے آسمان کی جھیل میں چاند کا سنہری کنول ہچکولے لے رہا تھا اور دریا کی پرسکون اور نرم موجیں اجلا گھاٹ کے چکنے پتھروں سے جڑے کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہوا کے نرم جھونکوں میں دریا کی نمی اور ٹھنڈک سمائی ہوئی تھی۔

ایسے میں پنوں اور سسی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساحل پر ٹہل رہے تھے۔ شب و روز ان کے اسی طرح گزر رہے تھے۔ وہ ہر پل ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ایک دوسرے کا چہرہ تکا کرتے اور وصل کے جام سے قربت کی مے گھونٹ گھونٹ پیتے اور فرقت کی پیاس بجھاتے۔ شام ہوتے ہی اکثر وہ دونوں دریا کے کنارے کی جانب نکل جاتے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گیلی ریت پر خراماں خراماں چلتے دور تک چلے جاتے۔

وہ ایک دوسرے کو پا کر دنیا کو بھول بیٹھے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی تو سسی کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ خود کو بھی بھول چکی ہے۔ وہ خود کو کہیں کھو چکی تھی۔ وہ اپنا آپ فراموش کر بیٹھی تھی۔ اب اسے اپنے تن من سے پنوں ہونے کا احساس جاگتا محسوس ہوتا تھا۔ اسے یوں لگتا کہ وہ اور پنوں دو وجود نہیں بلکہ ایک ہی وجود ہیں اور وہ خود کوئی اور نہیں صرف پنوں ہو۔

’’تم جانتے ہو پنوں...... تمہاری یہ سسی تم سے کتنا پیار کرتی ہے۔ تم اس قدر مجھ میں بس گئے ہو کہ دوئی کا احساس تک مٹ گیا ہے۔‘‘

’’ہاں جانتا ہوں۔‘‘ پنوں نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ’’کیونکہ میں بھی تم کو اتنا ہی چاہتا ہوں۔ تمہارے بغیر میں سانس بھی نہیں لے سکتا۔‘‘

’’پنوں آکاش پر چمکتے اس ماہ روشن کی قسم کھاؤ اور مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی مجھ سے جدا نہیں ہو گے۔‘‘

’’میں بھنبھور کے اس چاند یعنی اپنی سسی کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے کبھی دور نہیں ہوں گا۔ تمہارے ساتھ ہی جیوں اور تمہارے ساتھ ہی مروں گا۔‘‘

’’اوہ میرے پنوں۔‘‘ سسی نے بے ساختہ اپنا سر اپنے محبوب کے کشادہ سینے پر رکھ دیا تھا۔

کچھ دیر دریا کی سیر کے بعد وہ دونوں گھر لوٹ آئے۔ ان کے گھر پہنچتے کے کچھ ہی دیر بعد پنوں کے تینوں بھائی، ریمز، چڑے اور ہوتی اپنے اونٹوں پر سوار سسی کے گھر آ پہنچے تھے۔

پنوں اپنے بڑے بھائیوں کو دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

’’آپ تینوں...... ادھر بھنبھور میں کیسے؟‘‘ اس نے حیرت بھری مسرت سے سوال کیا۔ ’’تم کو دیکھنے تم سے ملنے آئے ہیں۔‘‘ بڑے بھائی ریمز نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’تم یہاں کے جلوؤں میں اس طرح ڈوبے کہ اپنے گھر، بھائیوں، ماں حتیٰ کہ باپ کو بھی بھول گئے۔‘‘

’’نہیں ایسا تو نہیں ہے۔‘‘ پنوں نے قدرے شرمسار لہجے میں کہا۔ ’’خیر اب آپ لوگ آئے ہیں تو کچھ دن یہاں میرے پاس ٹھہریں اور اپنی بھابھی سسی سے ملیں۔ آپ کو حیرت ہوئی ہو گی...... مگر ایسا ہی ہے میں نے یہاں ایک سسی نامی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔‘‘

پنوں تینوں بھائیوں کو گھر کے اندر لے گیا اور سسی سے ملوایا۔ تینوں سسی کا بے پناہ حسن دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ پنوں کیوں دنیا تج کر، سسی کے پہلو میں پڑا ہے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ پنوں سسی کو چھوڑ کر کسی بھی قیمت پر گھر واپس نہیں جائے گا اور وہ سسی کو، ایک دھوبن کو اپنے شاہی محل کی زینت بنانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

’’پنوں کو ہم اپنے ساتھ کیوں کر لے جا سکیں گے؟‘‘ منجھلے بھائی چڑے نے حیرانی اور سراسیمگی سے سوال کیا۔

’’تم دونوں بے فکر ہو جاؤ۔ پنوں کو ساتھ لے جانے کی ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔ اسے ہر حال اور ہر قیمت پر بابا کے پاس لے کے جانا ہے ورنہ بابا اس کے فراق میں جان دے دیں گے۔‘‘

پنوں بھائیوں کی آمد پر بے حد خوش تھا اور اسے خوش دیکھ کر سسی بھی خوش تھی اور جیٹھوں کی خاطر مدارات میں لگی تھی۔

’’کیوں نہ تمہارے بھائیوں کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا جائے۔‘‘

دوسرے دن سسی نے پنوں سے کہا تو پنوں خوش ہو گیا۔

اگلی شام اس نے بھائیوں کی آمد کی خوشی میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ بہترین کھانے کے ساتھ موسیقی کا بھی انتظام تھا۔ بھنبھور کی سب سے سریلی مغنیہ کو طلب کیا گیا تھا۔ دسترخوان پر اشتہا انگیز لذیذ کھانے چنے ہوئے تھے۔ مغنیہ نغمہ سرا تھی اور مہمانوں کے ساتھ چاندی کی صراحیوں میں مے بھری رکھی تھی۔ مہمان خم کے خم لنڈھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد پنوں بھی اس مشغلے میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے منصوبے کے مطابق پنوں کو خوب شراب پلائی اور جب وہ بے خود و مدہوش ہو گیا تو اسے اٹھا کر اونٹنی پر ڈالا۔ تینوں بھائی بھی اونٹوں پر سوار ہوئے اور تیزی سے کیچ مکران کی طرف روانہ ہو گئے۔

سسی اندر اپنی خوابگاہ میں نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کی دنیا لوٹ لی گئی۔

ناقہ بے مہر ساربان دشمن سر بسر اہل کارواں دشمن
آج شاید کہیں اماں نہ ملے سفر عشق ہے اماں دشمن

صبح سسی کی آنکھ کھلی تو وہ گھبرائی ہوئی مردانے کی طرف بھاگی مگر وہاں تو لٹی انجمن کے آثار بکھرے ہوئے تھے۔ نہ پنوں تھا نہ اس کے بھائی۔ اس کے پوچھنے پر نوکروں نے بتایا کہ شاید پنوں اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنے وطن کو چلا گیا ہے۔

یہ سن کر سسی پاگل ہو اٹھی۔ اس نے بال نوچنا اور دہائیاں دینی شروع کر دیں۔ بچائی کو پتہ چلا تو وہ بھی دوڑی چلی آئی۔ سسی کی حالت دیکھ کر وہ بھی دنگ رہ گئی۔

سسی کے باپ اور سکینہ کا بھی حال برا تھا۔ وہ پنوں کے جانے اور بیٹی کی تباہی پر بے حد افسردہ تھے۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ ان سے اپنی لاڈلی کی تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی۔

’’سسی مجھے یقین ہے پنوں خود نہیں گیا۔ اس کے بھائی اسے دھوکے سے لے گئے ہیں۔‘‘ بچائی، سسی کے پریشان الجھے بالوں کو سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ’’ذرا دھیرج رکھو پنوں چند ہی دنوں میں واپس لوٹ آئے گا۔‘‘

’’مگر بچائی، میں یہ چند دن کیونکر گزاروں گی۔‘‘ سسی نے روتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ ’’پنوں کے بغیر میں ایک پل نہیں گزار سکتی ناکہ چند دن۔‘‘ وہ آنچل میں چہرہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ شام ہونے تک اس کی وحشت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ دیواروں سے ٹکریں مار کر چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے شام ڈھلی اور ہر سو رات کی سیاہی بکھر گئی۔ سسی خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور دبے پاؤں گھر سے باہر نکلی اور کیچ مکران کی طرف پیدل چل دی۔ وہ اشکبار آنکھوں اور تڑپتے دل کے ساتھ انجانے راستوں پر، انجانی منزل کی جانب رواں دواں تھی اور اس کے خشک ہونٹوں پر درد بھرے الفاظ رواں تھے۔

’’میرے محبوب مہار تھام کر اونٹنی کو روک لو، اپنی اس دیوانی کو چھوڑ کر مت جاؤ...... اس کی چوکھٹ پر لوٹ آؤ...... میرے محبوب میں نے تمہاری جدائی میں ہر پل ہر لمحہ ایک قیامت میں گزارا ہے...... تمہارے حصے کے دکھ بھی مجھے مل جائیں۔ خدا کرے تمہارے اونٹوں کو دھوپ نہ لگے۔ اے کاش تمہیں راستے میں پیاس نہ لگے۔‘‘

وہ آنسو بہاتی لڑکھڑاتے قدموں اور غم سے چور دل کے ساتھ تمام رات صحرا میں سفر کرتی رہی۔ نہ سمت کا پتہ تھا، نہ راستے کی خبر، منزل سے وہ بالکل ناواقف تھی۔ بس دل میں اپنے محبوب سے ملنے اور اسے دیکھنے کی تڑپ اور لگن تھی، جس نے اسے چلنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ وہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں سے پنوں کا پتہ پوچھتی، ہواؤں میں پنوں کی مہک تلاش کرتی اور صحرا کے ریتیلے راستوں پر پنوں کے قدموں کے نشان کھوجتی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

رات گزری، دن چڑھا...... نیلے آسمان کے سینے پر دہکتے انگارے کی طرح سورج چمکنے لگا۔ ہواؤں میں تپش جاگ اٹھی تھی اور تیز دھوپ نے ریت کو جھلسانا شروع کر دیا تھا۔ سسی کی چپلیں جانے کہاں ریت میں گم ہو چکی تھیں۔ وہ سلگتی ریت پر ننگے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے بال خاک آلود اور لب پپڑی زدہ خشک تھے۔ بھوک اور پیاس کے احساس سے عاری وہ صرف محبوب سے ملنے کے شوق میں آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

گرم ریت پر چلنے کے باعث اس کے نرم و نازک پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ حلق خشک ہو چکا تھا۔ چہرے اور بالوں میں ریت اٹی ہوئی تھی۔ وہ پنوں کو آوازیں دیتی بے سمت راستوں میں بے نشان منزل کی جانب رواں دواں تھی، جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اس کی وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ بنجر سے، ریگ زار اور آکاش میں ڈولتی چیلوں سے پنوں کا پتہ دریافت کر رہی تھی۔

تب ہی اسے دور ایک جھونپڑی دکھائی دی تھی۔ وہ تیزی سے جھونپڑی کی جانب بڑھی۔ شام ڈھل رہی تھی۔ ہر سمت سرمئی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ ایسے میں سسی نے جھونپڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک جواں سال چرواہا نکلا۔ وہ اس صحرا میں اپنی چند بھیڑوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔

اس ریگ زار میں وہ سسی جیسی حسین لڑکی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ سسی نے اس سے سوال کیا۔ ’’تم نے کہیں میرا پنوں دیکھا؟‘‘

’’پنوں؟‘‘ چرواہے نے حیرت سے نام دہرایا۔ پھر سسی کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ سسی کے پیر زخمی، چہرہ اور بال گرد آلود اور کپڑے میلے تھے۔ مگر اس کا حسن اس حال میں بھی قیامت خیز تھا۔

چرواہے کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے سسی کا بازو پکڑا اور زبردستی اندر لے جانے کی کوشش کی۔ اس عالم دیوانگی میں سسی کو اپنی عزت کا پاس تھا۔ وہ پنوں کی امانت تھی، وہ پنوں کی محبت تھی۔ وہ خود کو بھلا کسی اور کے حوالے کس طرح کر سکتی تھی...... مگر سسی نے ذہانت سے کام لیا اور نحیف و نزار آواز میں بولی۔ ’’مجھے سخت پیاس لگی ہے...... پہلے ذرا دو گھونٹ بھیڑ کا دودھ پلا دو۔‘‘

چرواہا خوش ہو کر بولا۔ ’’ابھی لو میں ابھی پیالا بھر کر دودھ لاتا ہوں۔‘‘

سسی نے آہستہ سے آگے بڑھ کر مٹی کے پیالے میں اپنے کنگن کے ہک سے مہین سا سوراخ کر دیا جو چرواہے کی نظر سے پوشیدہ رہا۔ وہ پیالا لے کر بھیڑوں کا دودھ دوہنے لگا۔ وہ آنکھوں میں طلب لئے سسی کو دیکھتا جاتا تھا اور دودھ دوہتا جاتا تھا۔ مگر پیالے کے سوراخ سے سارا دودھ نیچے گر کے ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ مگر اسے پتہ نہ تھا۔

اس دوران سسی گڑگڑا کر دھرتی ماں سے گزارش کرتی رہی۔ ’’اے دھرتی ماں...... میں پنوں کی امانت ہوں۔ مجھے خیانت سے بچا لے۔ مجھے اپنے دامن میں چھپا لے۔‘‘

اس کی دعا قبول ہوئی۔ یکا یک دھرتی کا سینہ شق ہوا۔ سسی اس میں سما گئی۔ زمین اپنی اس پوتر اور پاکیزہ بیٹی کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر پھر برابر ہو گئی۔ فقط ایک گوشے میں سسی کے دوپٹے کا کونا باہر جھانکتا رہ گیا۔

o......o......o

ادھر پنوں کا جب نشہ ٹوٹا اور وہ ہوش میں آیا تو خود کو بھائیوں کے نرغے میں اونٹ پر سوار پایا۔ اس نے حیرانی و پریشانی سے سوال کیا۔ ’’بھائیو! یہ سب کیا ہے تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو۔ میری سسی کہاں ہے؟‘‘

بھائیوں نے اسے بتایا کیونکہ اس کا باپ اس کے لئے تڑپ رہا ہے اس لئے وہ اسے ہمیشہ کے لئے اپنے وطن لے جا رہے ہیں۔ اب سسی کو بھول جاؤ۔ یہ سنتے ہی پنوں نے ’’ہائے سسی‘‘ کا نعرہ مارا اور اونٹ سے کود کر مخالف سمت دوڑنے لگا۔ وہ صحرا میں دوڑتا جا رہا تھا اور ’’سسی سسی‘‘ پکارتا جاتا تھا۔ وہ تمام دن اسی طرح برہنہ پا صحرا میں دوڑتا رہا۔

جب شام ہوئی تو اسے ایک طرف روشنی سی نظر آئی، وہ اس جانب چل دیا۔ ادھر ایک جھونپڑے کے سامنے ایک چرواہا بیٹھا تھا۔

’’تم نے میری سسی کو دیکھا؟‘‘ پنوں نے بے خود سے لہجے میں چرواہے سے سوال کیا۔

’’ہاں، یقیناً وہ تمہاری ہی سسی تھی۔‘‘ چرواہا روتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس جگہ لے گیا جہاں سسی زمین میں سما گئی تھی۔ پھر اس نے اسے سسی پر بیتنے والی بپتا سنائی اور زمین سے باہر نکلا ہوا سسی کے دوپٹے کا پلو دکھایا۔

پلو دیکھتے ہی پنوں کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ چیخ مار کر پلو پر گر گیا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے آواز دی۔

’’میری سسی تو کہاں ہے؟‘‘

اس وقت زمین سے جواب آیا۔

’’میرے محبوب میرے پنوں...... میں یہاں ہوں۔ زمین کے اندر تیری منتظر۔‘‘

جھونپڑے سے لگا کھڑا چرواہا، اشکبار آنکھوں اور پشیمان دل کے ساتھ پنوں کی تڑپ اور سسی کا انتظار دیکھ رہا تھا۔ کل سے اب تک وہ ہزار بار رو رہا تھا۔ ہزار بار گڑگڑا کر اس نے نیک و پاکیزہ عورت سے اپنی گناہ آلود نظروں کی معافی مانگی تھی۔ اس پل بھی وہ دل ہی دل میں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا گو تھا۔

’’اے میرے رب! مجھ گناہ گار اور پاپی کی دعا قبول کر لے۔ یہ دونوں محبت کرنے والے بچھڑ گئے ہیں۔ انہیں ایک بار پھر ملا دے۔‘‘

شاید اس کی دعا قبول ہوئی۔

یا سسی کا انتظار رنگ لایا یا شاید پنوں کی دیوانگی کام آئی۔

زمین کا سینہ دوبارہ شق ہوا اور پنوں بھی اس میں سما گیا اور اپنی سسی سے بچھڑا ہوا پنوں ایک بار پھر اپنی محبوبہ، اپنی زندگی سے جا ملا۔

ان کے باہم ملتے ہی زمین دوبارہ پہلے کی طرح برابر ہو گئی۔ اب ان دونوں کو کوئی جدا نہ کر سکتا تھا۔ وہ جیتے جی ساتھ نہ رہ سکے مگر مر کر وہ ایک ہی قبر میں دفن ہو کر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے وجود کا حصہ بن گئے۔ وہ دونوں فنا ہو گئے، مٹ گئے...... پر ان کی محبت اَن مٹ اور لافانی ہو گئی۔ ان کی سچی محبت کی لازوال کہانی، آج بھی زندہ ہے...... اور شاید رہتی دنیا تک زندہ رہے گی۔ (ختم شد)